دروازے کے قریب رک گئی۔۔۔۔ماں نے کہا ''بیٹی بیٹھ جاؤ'' اور وہ جھجکتی ہوئی کمرے کے کونے میں کرسی پر بیٹھ گئی سلیم نے مختصراً اپنی سرگذشت سنادی۔

عصمت کی ماں نے کہا ''بیٹا! یہ وزارت کب ختم ہوگی؟''

سلیم نے جواب دیا ''یہ ہماری ہمت پر منحصر ہے میرے خیال میں اگر مسلمانوں کا یہی جوش وخروش رہا تو موجودہ حکومت دو ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکتی۔''

ماں بولی ''ارشد کے ابا کا بھی یہی خیال تھا۔''

تیسرے دن سلیم وہاں سے یہ احساس لے کر رخصت ہو رہا تھا کہ عصمت اس کے دل و دماغ اور روح کی پرواز کا مرکز بن چکی ہے۔اس نے اس کے ساتھ بہت کم باتیں کی تھیں اور شائد کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو اس کے دل کی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی۔تاہم سلیم نے ہر لفظ کے ساتھ اس کے سادہ اور معصوم دل کی دھڑکنیں سنی تھیں۔وہ ان جھکی جھکی اور شرمائی ہوئی نگاہوں کو دیکھ چکا تھا جو کہہ رہی تھیں ''میں تمہاری ہوں، میں روز ازل سے تمہاری ہوں اور تم میرے ہو، ہمیشہ کے لیے میرے!''

عصمت کی ماں نے رخصت کے وقت سلیم کو ایک لفافہ دے کر تاکید کی تھی کہ وہ اسے اپنی ماں کے سوا کسی کو نہ دکھائے اور سلیم دیکھے بغیر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس خط کا اس کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔



یونینسٹ وزارت کے ہندو سرپرستوں کا خیال تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کا جوش وخروش ہنگامی ہے اور اسے پولیس کی لاٹھیوں سے ٹھنڈا کرنے کے بعد شمال مغرب میں ہندو فاشزم کی یلغار کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلم لیگ نے کسی منظم پروگرام اور تیاری کے بغیر یہ تحریک چلائی ہے اور جس طرح انگریز نے کئی بار اگلی صف کے لیڈروں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر کر کے کانگرس کی بڑی سے بڑی تحریک کو ٹھنڈا کر دیا تھا، اسی طرح مسلم لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف مسلم عوام کا مورچہ ٹوٹ جائے گا لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا لیڈروں کی جماعت کی تحریک نہ تھی۔ خضر نے ہندو مقاصد کی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ کر پنجاب کے مسلم جمہور کو چیلنج دیا تھا اور اس چیلنج کے بعد اسے معلوم ہوا کہ لیگ اور پنجاب کے ننانوے فی صدی مسلمان ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ اجتماعی خطرہ اجتماعی قوت مدافعت کو بیدار کر چکا تھا اور کرائے کے وہ ٹٹو جنہیں ہندو نے وزارت کا توبرا دکھا کر اقتدار کے رتھ میں جوت لیا تھا، اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ دلدل میں پاؤں رکھ چکے ہیں۔

پاکستان کے نعرے کو جو تقویت برسوں میں حاصل نہ ہوئی تھی، وہ اس چونتیس دن کی عملی جدوجہد میں حاصل ہو چکی تھی بالآخر خضر حیات خان کانگرس کے رتھ سے اچانک اپنا رسا تڑا کر بھاگا اور گورنر نے مجبوراً مسلم لیگ کے لیڈر کو تشکیل وزارت کی دعوت دی لیکن کانگرس اس صورت حالات کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ مکڑی جس نے

برسوں کی محنت سے مکروفریب کے سنہری تاروں کا جال تیار کیا تھا، منہ میں آیا ہوا شکار جاتے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئی۔ ہندو ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اس لیے حکمران تھا کہ وہاں ہندوکی اکثریت تھی ہندو مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس لیے برسر اقتدار رہنا چاہتا تھا کہ وہاں بعض ماؤں نے ملت فروشوں کو جنم دیا تھا۔ اب ہندو اس لیے برہم تھا کہ پنجاب کی مسلم اکثریت اس کے تسلط سے آزاد ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک پنجاب میں مسلم اکثریت کی نمائندہ وزارت کا قیام پانچ دریاؤں کی سرزمین کے عملی طور پر پاکستان میں شامل ہو جانے کے مترادف تھا، اس لیے پنجاب میں بھی کانگرس کو اپنا قدیم چولا تبدیل کرنا پڑا۔ مسلمان بھی عدم تشدد کے علمبرداروں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ رہے تھے۔ کانگرسی فاشزم اپنے قدیم ہتھیار بے کار دیکھ کر نئے حربوں کے ساتھ میدان میں آ چکا تھا۔ گاندھی کی آتما تارا سنگھ کی زبان سے بول رہی تھی ''ہندوؤ اور سکھو! تمہارے امتحان کا وقت آ چکا ہے۔ جاپانیوں اور نازیوں کی طرح تباہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہماری ماتر بھومی خون کے لیے پکار رہی ہے ہم خون کے ساتھ اس کی پیاس بجھائیں گے۔ ہم نے مغلستان کو ختم کیا تھا اور ہم پاکستان کو پاؤں تلے روندیں گے۔ ہم زندہ رہیں یا مر جائیں لیکن پنجاب میں مسلمانوں کا اقتدار قبول نہیں کریں گے۔''

ڈاکٹر گوپی چند کہہ رہا تھا ''ان دنوں ایسے مظاہرے کرو کہ ہم میں سے کوئی بھگوڑا بن کر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔''

ہندو اور سکھ پریس بیک زبان چلا رہا تھا۔ ''ہم ایسے حالات پیدا کر دینا اپنا فرض

سمجھتے ہیں جن کے باعث پنجاب میں لیگی وزارت کا قیام ناممکن ہو جائے۔"

چنانچہ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے۔ کانگرس، سکھوں اور سنگھیوں کی قوت کے بل بوتے پر اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ کو پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں کے متحدہ محاذ کا لیڈر بنایا گیا۔ اس نے پنجاب اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی کرپان بے نیام کی اور مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ گاندھی کے امن پسند چیلے سکھوں کی تیاریوں کے پیش نظر پنجاب میں بہار کی تاریخ دہرانے کے متعلق پر امید تھے لیکن ان کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ ماسٹر تارا سنگھ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکا کہ "سکھ پنجاب سے مسلمانوں کو نکال کر دم لیں گے" ماسٹر تارا سنگھ کے سورما اٹک تک پہنچے بغیر دم نہ لینے کا عہد کر کے میدان میں آئے تھے لیکن بھارت کے بیٹے حیران تھے کہ امرتسر اور لاہور کے بازاروں میں نہتے مسلمان ان سورماؤں کی کرپانیں چھین رہے ہیں ۔۔۔۔ راولپنڈی، ملتان اور دوسرے شہروں میں بھی وہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکے۔

سکھوں کا سب سے بڑا محاذ امرتسر تھا ۔۔۔۔۔۔ امرتسر کے گوردوارے اور مندران افواج کے باورچی خانے تھے جو پنجاب کے مسلمان کے ذہن سے پاکستان کا تصور مٹانے کے لیے میدان میں آنے والی تھیں لیکن ان فوجوں کی کامیابیاں مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کو جلانے اور عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے تک محدود رہیں۔ امرتسر کے مسلمانوں نے اچانک حملے کے باعث شروع میں کافی نقصان اٹھایا۔ سکھوں نے نہتے راہگیروں پر بندوقوں اور پستولوں سے نشانہ بازی

کی مشق کی بچوں اور عورتوں پر اپنی کرپانوں کی دھار کی تیزی آزمائی لیکن جب باہمت نوجوانوں کا ایک گروہ میدان میں آ گیا تو یہاں بھی لاہور اور دوسرے شہروں کی طرح یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ سفاکی اور بزدلی ایک ہی برائی کے دو نام ہیں۔

پنجاب کے مسلمان زیادہ دیر خاموش تماشائیوں کی حیثیت میں سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے گھر جلانے کی اجازت نہ دے سکے۔ انہوں نے ان کرپانوں کو چھیننے کی کوشش کی جو رام راج کے قیام کے لیے بے نیام ہوئی تھیں۔ اس لیے کانگرس کی نظر میں وہ مفسد تھے۔ انہوں نے اکالی دل، سیوادل اور راشٹریہ سیوک سنگھ کو سورماؤں کو بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے قتل عام سے روکا لہٰذا وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست تھے۔ ان کی قوت مدافعت نے کانگرس کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ وہ سکھوں کی قوت کے بل بوتے پر پنجاب کو اکھنڈ ہندوستان میں شامل کر سکتی ہے۔ اس لیے کانگرس جو ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کو گائے کے دو حصوں میں کٹ جانے کے مترادف قرار دے چکی تھی، اب پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ بنگال اور آسام کو بھی تقسیم کروانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اور تقسیم کے لیے کانگرس کے یہ دلائل تھے کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے تو مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کے علاقوں کی ہندو اکثریت کو بھی پاکستان میں مسلم اکثریت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں ہندو اور دوسری اقلیتوں کے جان و مال اور تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لیے ان صوبوں کی تقسیم ضروری ہے۔

ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو کانگرس کا یہ استدلال پسند آ گیا۔اس لیے 3جون کے اعلان کے مطابق ان صوبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔آسام کے ضلع سلہٹ،صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے ریفرنڈم تجویز ہوا۔



یہ کہنا غلط ہو گا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم فسادات کا نتیجہ تھی فسادات بہار،یو پی اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی ہوئے تھے،اور ان صوبوں میں ایسے علاقے بھی تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی،اگر مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے ہندو کو پاکستان کی مسلم اکثریت سے خطرہ تھا تو بہار،یو پی اور دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے کم خطرہ نہ تھا۔اگر پنجاب اور بنگال کے دو کروڑ غیر مسلموں کو پاکستان کے وسیع اور زرخیز علاقے کاٹ کر دیے جا سکتے تھے،تو ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی ہندوستان کے بعض حصوں پر اپنا حق رکھتے تھے۔اگر ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے تقسیم ہوتی تو دس کروڑ مسلمان ایک چوتھائی سے زیادہ کے حق دار تھے۔بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔بلکہ یو پی، بہار اور آسام کے کچھ حصے پاکستان میں شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان کے جنوب میں بھی مسلمانوں کی ایک پاکٹ بنتی تھی۔

لیکن ایسا نہ ہوا ہندو اور انگریز کی سازش نے ایسا نہ ہونے دیا۔پنجاب اور بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی تھی،اور وہ اس بے انصافی کا مقابلہ کرنے

کے لیے تیار نہ تھے۔ قدرت انہیں یہ سبق دینا چاہتی تھی کہ وہ قوم جو بے انصافی اور بد دیانتی کے خلاف لڑنے کی ہمت نہیں رکھتی، دیانت اور انصاف کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں نے آزاد وطن کی تمنا کی تھی انہوں نے زندہ ہوا اور زندہ رہنے دو کا اصول پیش کیا تھا۔ ان کے لیڈروں نے پاکستان کے حق میں دلائل دیے تھے نعرے لگائے تھے تقریریں کی تھیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان، انگریز، کانگرس اور ان کے درمیان منطق کی ایک گتھی ہے، اور جب یہ سلجھ جائے گی، پاکستان انہیں مل جائے گا لیکن بہت کم ایسے تھے جنہیں یہ احساس تھا کہ تاریخ کی بعض گتھیاں قلم اور زبان سے زیادہ نوک شمشیر کی محتاج ہوتی ہیں۔

مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے اس نا منصفانہ فیصلے کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری نہیں کی تھی۔۔۔۔ مسلم لیگ کے سپاہی بد قسمتی سے ابھی تک لکڑی کے گھوڑوں پر سوار تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے ڈیڑھ سو برس قبل ہندوستان کے راجوں اور نوابوں سے سودا بازی کی بدولت انگریزی سامراج کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اب یہ سامراج اپنا بوریا بستر باندھنے سے پہلے ہندو سرمایہ داروں سے سودا کر رہا تھا۔ فرنگی طبیب کسی راجے یا نواب کا علاج کرنے کے بعد اس کی ریاست میں اپنی قوم کے لیے تجارتی مراعات حاصل کیا کرتے تھے اور مونٹ بیٹن وہ جراح تھا جو انگریز تاجر اور ہندو مہاجن میں ناطہ جوڑنے کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی شاہ رگ کاٹ چکا تھا۔ مسلم لیگ کی آنکھیں بند نہ تھیں، وہ اس نشتر کو دیکھ رہی تھیں لیکن اس کے پاس وہ ہاتھ

نہ تھے جو لارڈ مونٹ بیٹن کا نشتر پکڑ لیتے۔۔۔۔! مسلم لیگ مجبور تھی کہ اس نشتر کا چرکا برداشت کرے لیکن مونٹ بیٹن اور ہندو کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ زخم ان کی توقع سے کہیں زیادہ گہرا ہو گا۔۔۔۔اور مونٹ بیٹن کی ناانصافی کے بعد ریڈ کلف کی بد دیانتی تاریخ انسانیت کے سب سے المناک حادثے کا باعث بن جائے گی۔

☆☆☆☆☆



اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ دوئم

داؤد کے پیچھے پندرہ بیس آدمیوں کی ٹولی نمودار ہوئی۔ مجید نے کہا۔ ''اب پھاٹک کھولنا مشکل ہے۔ تم دیوار پھاند کر اندر آ جاؤ.......... تمہارے ساتھ اور مسلمان بھی ہیں؟''

''ہاں! بہت سے آدمی ہیں!'' داؤد نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تھوڑی دیر میں تمہاری حویلی میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں رہے گی۔ لوگ دور دور تک کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔''

''ان سب کو بلا لو، میں باہر دیوار کے ساتھ سیڑھی لگوا دیتا ہوں۔''

داؤد کے ساتھیوں نے کھیتوں میں چھپے ہوئے آدمیوں کو آوازیں دیں۔ آس پاس چھپے ہوئے لوگ ان کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے ہوئے کھیتوں سے باہر نکلنے لگے۔ آدھ گھنٹے کے اندر حویلی میں کوئی تین سو مرد، عورتیں اور بچے جمع ہو چکے تھے۔ کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ میرا سارا کنبہ مارا جا چکا ہے اور کوئی کہہ رہا تھا کہ میرے خاندان میں سے صرف ایک بوڑھے اور ایک بچے کے سوا کوئی نہیں بچا!''

''سکھ ہمارے گاؤں کی اتنی عورتیں چھین کر لے گئے ہیں!''

''ہمارے گاؤں کی اتنی عورتوں نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی!''

''میرے دودھ پیتے بچے کو نیزوں پر اچھالا گیا!''

''فلاں گاؤں میں سکھ فوج نے سارے آدمیوں کو مار دیا اور عورتوں کے ساتھ یہ سلوک کیا!''

''اب کیا ہو گا۔ اب ہم کیا کریں۔ اب ہم کہاں جائیں؟''

''پاکستان بہت دور ہے!''

''کہتے ہیں کہ بلوچ رجمنٹ نے امرتسر میں ہزاروں مسلمانوں کی جان بچائی ہے، اسے ادھر کیوں نہیں بھیجا گیا؟''

''میاں سلیم! وہ میری بیوی کو چھین کر لے گئے ہیں۔ میں سر پر زخم کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے میری ماں کے ساتھ ......!''

عرض ہر عورت، مرد، بچے اور بوڑھے کی ایک نئی داستان تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے منہ میں الفاظ تھے نہ آنکھوں میں آنسو۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے اور ہلکی ہلکی سسکیاں بھر کر خاموش ہو جاتے۔

ایک شخص حویلی میں داخل ہوتے ہی چلایا۔ ''دنیا میں اب میرا کوئی نہیں۔ میرے پانچ بیٹے تھے۔ تین لڑکیاں تھیں اور تین پوتے تھے۔ اب میں اکیلا ہوں!''
یہ خیر دین کمہار تھا۔

غلام حیدر (مجید کے باپ) نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''خیر دین صبر کرو!''

خیر دین غلام حیدر سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کی دیکھا دیکھی عورتوں کی دبی اور گھٹی ہوئی چیخیں بلند ہونے لگیں۔



رات کے وقت مجید اور داؤد مسجد اور مکانوں کی چھتوں پر مٹی کی بوریوں کے مورچے بنوا رہے تھے۔ سلیم حویلی کے ایک کونے میں شہیدوں کو دفن کروا رہا تھا۔ کا کو قبریں کھودنے میں ان کی مدد کے لیے گاؤں کے چند عیسائیوں کو لے آیا تھا۔ لیکن چالیس لاشوں کے لیے علیحدہ علیحدہ قبریں کھودنا ممکن نہ تھا۔ باہر سے آنے والے آدمیوں میں نصف سے زیادہ زخمی تھے اور باقی بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال۔ اس لیے ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی ...... سلیم نے چچا غلام حیدر کے مشورے سے ایک لمبی سی کھائی کھدوائی اور سب لاشوں کو ایک قطار میں لٹا کر مٹی ڈال دی گئی۔

افضل اور اسماعیل کو سب سے آخر میں دفن کیا گیا۔ جب اسماعیل کی لاش پر مٹی ڈالی جا رہی تھی تو کا کو عیسائی نے کہا۔ "آج ہمارا گاؤں مر چکا ہے۔ آج کے بعد اس بستی کے لوگ ہنسنا بھول جائیں گے۔ میاں سلیم! چودھری رمضان کی لاش ابھی تک کچھمن سنگھ کے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔ میں دیکھ آیا ہوں۔ اسماعیل کہا کرتا تھا کہ ہماری قبریں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گی۔ ہم اسے لے آتے ہیں۔ اسے یہیں دفن کروا دیجیے!"

سلیم کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "جاؤ ان سب کی لاشیں لے آؤ!"

رمضان کو اسماعیل کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ سلیم بالا خانے سے وہ ٹوٹا ہوا جھنڈا اٹھا لایا جس کا ہلال اور ستارہ اسماعیل کے خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے

پرچم کو ایک لاٹھی کے ساتھ باندھا اور اسماعیل کی قبر پر گاڑ دیا۔

گھر میں عورتیں بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے لیے کھانا تیار کر چکی تھیں۔ مجید مورچے بنوانے کے بعد نیچے اترا اور آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو بھئی میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کسی کا کھانے کو جی نہیں چاہتا لیکن تمہیں دل پر جبر کر کے دو دو چار چار لقمے ضرور کھا لینے چاہیں۔ خدا معلوم صبح کو کھانے کا وقت ملے گا۔ یا نہیں اور بھوکے رہ کر ہم زیادہ دیر نہیں لڑسکیں گے!''

مجید کے اشارے سے چند آدمیوں نے زمین پر چٹائی بچھا دی اور اس پر ابلے ہوئے نمکین چاول کے چند طشت لا کر رکھ دیے۔ قدرے تذبذب کے بعد چند آدمیوں نے پہل کی اور باقی ان کی دیکھا دیکھی کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

باہر سے کسی نے پھاٹک کو دھکا دیتے ہوئے آواز دی۔ ''پھاٹک کھولو!''

مجید نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''میں فجو ہوں!''

''فجو! تمہیں ان کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں ابھی تمہارے طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔''

''صوبیدار میں انہیں ساتھ لے آیا ہوں، میں پیاس سے مر رہا تھا!''

''بھئی ان کا خیال رکھو کہیں بھاگ نہ جائیں!''

''جی آپ فکر نہ کریں۔ یہ بھاگ نہیں سکتے، میں نے انہیں اچھی طرح باندھ رکھا ہے!''

''اب دروازہ نہیں کھل سکتا۔ٹھہرو! میں آتا ہوں!'' یہ کہتے ہوئے مجید دیوار پھاند کر باہر نکل گیا۔

رام چند اور کندن لال دونوں عام انسانوں سے بھاری تھے۔تاہم مجید اور فجو نے معمولی جدوجہد کے بعد انہیں اٹھا کر دیوار کے اوپر سے اندر لڑھکا دیا۔

سلیم نے ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور لوگ انہیں پہچان کر ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔سلیم اور مجید نے ابھی تک کسی سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا اور لوگ حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''یہ رام چند ہے۔ یہ رام چند ہے۔'' ان کے گاؤں کا ایک نوجوان چلاتا ہوا آگے بڑھا اور رام چند پر ٹوٹ پڑا۔رام چند اس کے ایک ہی مکے سے گر پڑا، اس نوجوان کا ایک اور ساتھی کندن لال پر پل پڑا۔سلیم اور مجید نے انہیں بڑی مشکل سے علیحدہ کیا۔رام چند پر حملہ کرنے والا نوجوان اپنے ساتھی کی نسبت زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔مجید نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے اور وہ چلا رہا تھا۔'' صوبیدار جی! آپ کو اس کا پتہ نہیں۔ یہ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔آپ کے گاؤں پر حملہ کرنے والے سکھوں کو اسی نے جمع کیا تھا۔اسی نے انہیں بندوقیں لا کر دی تھیں۔ جتھے کے ساتھ میں نے اس کی تقریر سنی تھی۔ یہ انہیں کہہ رہا تھا کہ ایک مسلمان کو بھی زندہ مت چھوڑو......اگر یہ بدمعاشی نہ کرتا تو مہندر نے سکھوں کو روک لیا ہوتا۔اسے زندہ چھوڑنا گناہ ہے۔''

ایک بوڑھا آدمی غلام حیدر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔''چودھری! میں نے بھی

اس کی باتیں سنی تھیں ۔ یہ کہتا تھا، ''رحمت علی کے گھر سے ڈولیاں لے کر آؤ لیکن جدا بڑا کارساز ہے۔ آج سکھوں کی ایک ٹولی اس کے اپنے گھر سے ڈولیاں لے گئی ہیں ۔'' پھر وہ رام چند کی طرف متوجہ ہوا۔ ''سیٹھ جی! آج ہم نے تمہارے گھر میں خالصتان دیکھا ہے۔ وہ تمہاری کوشلیا اور سرلا کو لے گئے ہیں اور تمہاری بیوی کو ادھ موا کر کے چھوڑ گئے ہیں ۔ رام چند! تم انہیں کہتے تھے کہ مسلمانوں کو یہاں مت چھوڑو......

ہم جانتے ہیں کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکیں گے لیکن تم بھی یہاں نہیں رہو گے، جن کتوں کو تم نے ہمارے پیچھے چھوڑا ہے، وہ تمہیں بھی کاٹیں گے۔''

رام چند کا خوف اضطراب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ چلایا۔ ''تم جھوٹ کہتے ہو ۔ہم جانتے ہیں کہ ہم تمہارے قبضے میں ہیں اور تم ہمیں زندہ نہیں چھوڑو گے لیکن سکھ یہ جرأت نہیں کر سکتے!''

بوڑھے آدمی نے طیش میں آ کر کہا۔ ''معاش! جو آگ پڑوسی کے گھر کو لگائی جائے وہ اپنے گھر کو بھی جلا دیتی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو گاؤں کے دوسرے آدمیوں سے پوچھ لے۔''

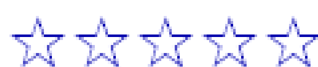
ایک اور آدمی بولا۔ ''چودھری جی! اگر وہ اس کے گھر کا مال اسباب لوٹنے اور عورتوں کی آبروریزی میں مصروف نہ ہو جاتے تو ہمیں بچ کر نکلنے کا موقع نہ ملتا، وہ ڈولیوں کے ساتھ اس کے گھر سے جہیز بھی لے گئے!''

رام چند تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد چلایا۔ ''میں نے اپنے کیے کا پھل پایا ہے۔ میاں سلیم میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد تمہیں میرا اعتبار نہیں

آئے گا لیکن تم اگر چھوڑ دو تو میں سکھوں سے بدلہ لے سکتا ہوں۔ ہندوستان پر کانگریس کی حکومت ہے۔ وہ سکھوں کی اس حرکت کو برداشت نہیں کرے گی۔ میں مشرقی پنجاب کے ہندو وزیروں اور گورنر کے پاس جاؤں گا۔ میں انہیں سمجھاؤں گا کہ تم سانپوں کو پال رہے ہو۔ میں سردار پٹیل اور نہرو کے پاس جاؤں گا۔ تم دیکھو گے کہ وہ ان کتوں کو تھپکیاں دینے کی بجائے اوران کے آگے زہر کی ڈالنے کی لیے تیار ہو جائیں گے !"

سلیم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "سیٹھ رام چند کوئی بات نہیں۔ گوشت کھانے والے کتے کبھی کبھی مالک کے ہاتھ سے بھی بوٹی چھین لیتے ہیں۔ تمہارے وزیر، تمہارا گورنر، تمہارے پٹیل اور نہرو مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو ختم کروانا چاہتے ہیں اور یہ کام انہوں نے سکھوں کے سپرد کیا ہے، جب تک یہ کام پورا نہیں ہو جاتا، وہ سکھوں کی ہر حرکت برداشت کریں گے۔ تمہاری سرلا اور کوشلیا کو وہ اپنی خدمات کا انعام سمجھ کر لے گئے ہیں۔"

مجید نے کہا۔ "وقت ضائع نہ کرو سلیم۔ یوسف تم انہیں کھانا اور پانی دو۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ انہیں قتل نہیں کریں گے۔ لیکن مسلمانوں کو ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اگر انہیں چھوڑ دیا جائے تو یہ دوبارہ شرارت نہیں کریں گے۔ ان کے پاؤں میں گھوڑوں کی زنجیریں ڈال دو اور انہیں گنڈیال کے اندر بند کر دو۔"



باہر سے آنے والے آدمیوں میں سات سابق فوجی تھے۔ مجید کے کہنے پر نا تجربہ کار آدمیوں نے اپنی بندوقیں ان کے حوالہ کر دیں۔ ایک عمر رسیدہ آدمی جس کے جسم پر ایک تہہ بند کے سوا کچھ نہ تھا، آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ''مجھے بھی ایک رائفل دے دو!''

مجید کے تذبذب پر وہ پھر بولا۔ ''میں ایک ریٹائرڈ جمعدار ہوں۔''

مجید اور بھی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک اور آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''یہ ہمارے گاؤں کے ہیں، جب حملہ ہوا تھا، یہ گاؤں سے باہر نہر میں نہا رہے تھے۔'' فجو پہلوان نے آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ ''ارے یہ تو جمعدار عنایت علی ہیں!''

سلیم اور مجید نے مسجد کی چھت کا مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ غلام حیدر اور گھر کے دوسرے نوجوان مکانوں کی چھتوں پر پہرا دے رہے تھے۔ داؤد چند آدمیوں کے ساتھ حویلی سے باہر گشت کر رہا تھا۔ بشیر نے ایک ٹولی کے ساتھ گاؤں میں چکر لگانے کے بعد اسے اطلاع دی۔ ''سکھوں کے تمام گھر خالی ہو چکے ہیں لیکن اندر سنگھ کے گھر میں کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ شاید اندر سنگھ کے بیٹے اندر چھپے ہوئے ہوں۔ آج وہ جتھے کے ساتھ تھے اور وہ شیر سنگھ جس پر افضل جان دیا کرتا تھا، آج نظر ہی نہیں آیا!''

داؤد نے اپنے ساتھیوں سے طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''تم یہیں رہو، میں ابھی آتا ہوں۔ آؤ بشیر میرے ساتھ!''

تھوڑی دیر بعد بشیر اور داؤد اندر سنگھ کے مکان کی چار دیواری سے باہر کھڑے تھے۔ صحن سے کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ داؤد ایک لمحہ توقف کے بعد دیوار پر چڑھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ صحن میں کوئی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور رونے والی عورت اس کے قریب زمین پر بیٹھی تھی۔

داؤد نے مڑ کر بشیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مجھے رائفل اور ٹارچ دے دو اور جب تک میں نہ بلاؤں، تم یہیں ٹھہرو!''

بشیر نے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ داؤد نے ٹارچ کی روشنی میں صحن کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی اور ایک سفید ریش بوڑھے کے سوا کوئی نہ تھا۔ لڑکی نے اچانک گردن اوپر اٹھائی اور خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''کون ہے؟''

داؤد نے اس کے جواب میں ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈال دی۔ لڑکی اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن بستر پر لیٹا بوڑھا جوں کا توں پڑا رہا۔

داؤد نے دیوار پر کھڑے ہو کر چھت پر روشنی ڈالی اور پھر مڑ کر بشیر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد نیچے کود پڑا۔

''تم کون ہو؟'' لڑکی بلند آواز سے چلائی اور خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔

''شور مت کرو۔ یہاں تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں۔'' داؤد یہ کہتے ہوئے چارپائی کے قریب پہنچ کر لیٹے ہوئے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے صحن کے ایک کونے میں پہنچ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اسے کچھ نہ کہو۔ یہ پہلے ہی مر چکا ہے۔ اسے لقوہ ہو گیا ہے!''

بشیر نے دیوار کے اوپر سے کودتے ہوئے کہا۔ ''یہ اندر سنگھ ہے۔ اس نے آج بابا رحمت علی سے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ نہیں کہتا تھا کہ آج تمہارے گھر بارات آئی ہے!''

داؤد نے کچھ کہے بغیر اپنی رائفل بشیر کے ہاتھ میں دے دی اور لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی دوڑ کر دیوار کے ساتھ مویشیوں کی کھرلی پر چڑھ گئی اور وہاں سے دیوار پھاندنے کی کوشش کرنے لگی لیکن داؤد نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے نیچے کھینچ لیا۔ لڑکی داؤد کے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں بے بس ہو کر چیخیں مار رہی تھی۔ داؤد اسے گھسیٹتا ہوا اندر سنگھ کے چارپائی کے قریب لے آیا اور بولا۔ ''اندر سنگھ! تو نے صرف دوسروں کے گھروں میں آگ لگانا سیکھا ہے، اپنا گھر جلتا نہیں دیکھا!''

لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ میں گلاب سنگھ کی بہن ہوں۔ میں شیر سنگھ کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ مسلمانوں کا دوست ہے!''

''ہم تمہاری دوستی دیکھ چکے ہیں!'' داؤد نے لڑکی کو دھکا دے کر زمین پر پھینک دیا اور اپنی جیب سے چاقو نکال لیا۔

بشیر نے رائفلیں زمین پر رکھ دیں اور آگے بڑھ کر داؤد کے ساتھ لپٹ گیا۔

داؤد چلایا۔ ''مجھے چھوڑ دو...... تم نہیں جانتے، انہوں نے میری ماں، میری بیوی، میری بہنوں اور میرے باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ میرے گھر پر حملہ کرنے والے ہمارے وہ پڑوسی تھے جن کے گھروں پر میں نے ڈیڑھ مہینہ پہرہ دیا تھا۔ میں نے ان کی خاطر اپنی چھٹیوں کی تمام راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ آج میرا باپ مر

رہا تھا اور میں اس کے لیے شہر سے دوائی لینے گیا تھا اور وہ جتھا لے کر آ گئے۔ انہوں نے میرے باپ کو قتل کیا۔ میری ماں اور میرے تین بچوں کو کوٹھری میں بند کر کے آگ لگا دی۔ میری بہنوں نے آبرو بچانے کر مسجد میں لے گئے...... اور وہاں......!

مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو!" داؤد نے جوش میں آ کر بشیر کی کلائیاں مروڑ ڈالیں اور اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ اتنی دیر میں لڑکی دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی اور کنڈی کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کنڈی نہ کھول سکے اور داؤد نے آگے بڑھ کر پھر اسے پکڑ لیا۔ وہ اب پوری طاقت سے چیخیں مار رہی تھی اور داؤد نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر دروازے کے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے سلیم کے گھر لے چلو۔ میں نے اسے بھائی بنایا تھا۔ وہ مجھے بہن کہا کرتا ہے۔ چچا افضل مجھے بیٹی کہا کرتا ہے۔"

داؤد نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چاقو بلند کیا۔ لڑکی اچانک خاموش ہو گئی اور پھر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس سے تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو مجھے مار ڈالو...... دیکھتے کیا ہو جلدی کرو!"

داؤد نے قدرے متاثر ہو کر کہا۔ "میں تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتا جو انہوں نے میری بیوی سے کیا ہے۔ تمہیں مرتے وقت اتنی تکلیف نہیں ہو گی......"

لڑکی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ داؤد نے چاقو کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی لیکن اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔ لڑکی نے کہا۔ "اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تو تم یوں نہ کرتے!"

داؤد نے اچانک کپکپی لی اور پیچھے ہٹ کر چاقو ایک طرف پھینک دیا۔بشیر نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔"

کسی نے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے آواز دی۔"داؤد......بشیر!"

"کون؟سلیم؟"بشیر نے سوال کیا۔

"ہاں، دروازہ کھولو۔یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

بشیر نے دروازہ کھول دیا۔سلیم چند آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔لڑکی نے جلدی سے سلیم کا بازو پکڑ لیا اور روتے ہوئے کہا۔"بھائی دوسروں کو یہاں بھیجنے کی بجائے تم نے خود یہاں آ کر میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ ڈالا؟"

"کون؟ روپا!......تو یہ تمہاری چیخیں تھیں؟"

لڑکی کی خاموشی پر داؤ نے جواب دیا۔"ہاں اسی کی چیخیں تھیں۔میں اسے قتل کرنے آیا تھا۔میں اپنے باپ، اپنی ماں، اپنی بہنوں اور اپنے بیوی بچوں کا انتقام لینے آیا تھا لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی۔میں نے قسم کھائی تھی کہ میں کسی پر رحم نہیں کروں گا۔میں نے اسے بوڑھے کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن میرے ہاتھ نہ اٹھ سکے۔میں نے اس لڑکی سے اپنی بیوی اور بہنوں کا انتقام لینا چاہا لیکن میرے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔"داؤد! کیا کر رہے ہو، یہ بھی کسی کی بہن ہے۔سلیم میں بزدل ہوں!"

سلیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔"تم بزدل نہیں ہو داؤد! میں چیخیں سن کر باہر نکلا تو مجھے پتہ چلا کہ اس طرف تم آئے ہو......مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ تم کسی عورت پر ہاتھ اٹھاؤ گے......یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں!"پھر قدرے توقف

کے بعد اس نے جوش میں آ کر کہا۔ ’’ہم انسانیت کے ان دشمنوں سے انتقام لیں گے ...... ہم اس قوم کو معاف نہیں کریں گے جس نے ہمارے احسانات کا یہ بدلہ دیا لیکن ہماری تلواریں مردوں کی تلواروں سے ٹکرائیں گی، بے کس عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر نہیں اٹھیں گی۔ ان مظالم کا جواب کسی دن پانی پت کے میدان میں دیا جائے گا لیکن ابھی شاید وہ وقت نہیں آیا۔‘‘

سلیم نے آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں اندر سنگھ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن ان میں آواز نہ تھی۔

بشیر بولا۔ ’’اس پر فالج گرا ہے!‘‘

سلیم لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’درپا! گاؤں کے تمام سکھ چلے گئے ہیں۔ میں صبح تک تمہاری حفاظت کا ذمہ لے سکتا ہوں لیکن اس کے بعد خدا معلوم کیا ہو۔ دور دور سے مسلمان ہمارے گاؤں کی طرف آ رہے ہیں، ان کے دل جلے ہوئے ہیں۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے تھا!‘‘

بھیا! میرے چچا، بابا کو اس حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن میں ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ وہ مجھے کھینچتے تھے لیکن میرے بھائی کی لاش یہاں پڑی ہوئی تھی اور بابا کی یہ حالت تھی۔ باپو کا کچھ پتہ نہیں، کہتے ہیں وہ کہیں شراب میں بے ہوش پڑا ہے۔ اگر وہ چچا افضل کے ساتھ ہوتا تو شراب نہ پیتا۔ میں چچوں کے ساتھ باہر نکلتے ہی گنوں کے کھیت میں چھپ گئی تھی ...... وہ چلے گئے تو یہاں آ گئی۔‘‘

سلیم نے کہا۔ ’’تمہاری ماں کہاں ہے؟‘‘

''وہ تو پہلے ہی اپنے میکے چلی گئی تھی!''

سلیم نے کہا۔''روپا! تمہارا بھائی ہماری خاطر مارا گیا ہے۔ میں اس کی لاش یہاں پہنچا دیتا ہوں!''

''نہیں! نہیں!! میں اس کی لاش نہیں دیکھ سکوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو!''

''لیکن تمہارا دادا؟''

لڑکی خاموش ہوگئی۔ سلیم نے کہا۔''دیکھو روپا! گلاب سنگھ کی بہن کے لیے میرے گھر کا دروازہ بند نہیں ہوسکتا لیکن تم وہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکو گی۔ تم ان بچوں کو نہیں دیکھ سکو گی۔ جو تمہاری قوم کے ہاتھوں یتیم بن گئے ہیں۔ تم بیواؤں اور زخمیوں کی آہیں نہیں سن سکو گی...... اور اب وہ گھر محفوظ بھی نہیں۔ ہم شاید صبح کا سورج دیکھ سکیں اور اگلی رات کے ستارے نہ دیکھ سکیں۔ تم یہیں رہو، میرے آدمی گلی میں پہرا دیتے رہیں گے......''

روپا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔''میں یہاں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ چچا افضل آئے گا اور مجھے کہے گا۔''روپا بیٹی! تمہیں یہاں اکیلی بیٹھے ڈر نہیں لگتا چلو میرے گھر چلو۔ تم خود ہی کیوں نہ آگئیں وہاں......''

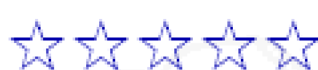
سلیم نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''چچا افضل اب تمہیں بلانے نہیں آسکتے!''

روپا دم بخود کر سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔''چلو داؤد!''

جب وہ باہر نکل رہے تھے تو روپا نے اچانک آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑ لیا۔ ’’سلیم! سلیم! مجھے بتا کر جاؤ، چچا افضل کو کیا ہوا؟‘‘

’’وہ شہید ہو چکے ہیں!‘‘

روپا سلیم کا ہاتھ چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ’’روپا! دروازہ اندر سے بند کر لو!‘‘



طلوع آفتاب تک سلیم کے گاؤں میں پناہ گزینوں کے تین اور قافلے آ چکے تھے اور ان کی مجموعی تعداد سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ آخری قافلے کے ساتھ چند آدمی ایسے بھی تھے جو دریائے بیاس عبور کر کے ساری رات چلنے کے بعد یہاں پہنچے تھے اور وہ یہ اطلاع دے چکے تھے کہ ان کے پیچھے دو ہزار آدمیوں کا ایک قافلہ اس طرف آ رہا ہے اور وہ دوپہر تک پہنچ جائے گا!‘‘

آٹھ بجے سکھوں نے حملہ کیا۔ اکال سینا کے ہراول میں باؤنڈری فورس کے وہ سکھ، گورکھا، ڈوگرہ اور مرہٹہ سپاہی تھے، جنہیں مسلمانوں کے خون سے آزاد ہندوستان کی تاریخ کا پہلا باب لکھنے کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کے ساتھ پولیس کے آدمی بھی تھے اور ان رائفلوں اور ٹین گنوں سے مسلح حملہ آوروں کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔ جتھے میں کوئی دو ہزار کے قریب آدمی تھے۔ جن میں سے پندرہ بیس کے پاس بندوقیں، دیسی اور ولایتی رائفلیں اور پستول تھے۔ باقی تمام نیزوں،

کرپانوں اور برچھیوں سے مسلح تھے۔ ماجھے کے علاقے کے پچاس آدمی گھوڑوں پر سوار تھے۔ فوج کے سپاہیوں نے دو فوجی ٹرک جن کا آگے لانا مشکل تھا، سڑک پر چھوڑ دیے اور تین جیپیں سڑک سے نیچے اتار کر گاؤں سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر لے آئے۔

مشرقی پنجاب کے دیہات میں اکال سینا کے حملہ آوروں کا ایک طریق کار یہ تھا کہ پہلے فوج اور پولیس مسلمانوں کے گھروں کے دروازے کھلوا کر ان کی تلاشی لیتی تھی۔ پھر انہیں یہ حکم دیا جاتا کہ وہ اتنی دیر کے اندر اندر گاؤں خالی کر دیں لوگ گاؤں سے نکلتے تو باہر سے سکھوں کے جتھے ان پر ٹوٹ پڑتے۔ اگر کہیں مزاحمت ہوتی تو فوج اور پولیس جدید ترین آلات حرب سے کام لینے سے دریغ نہ کرتی۔

بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں فوج کرفیو لگا دیتی۔ فوج کے سپاہی گلیوں اور بازاروں میں گشت لگاتے اور اس بات کا خیال رکھتے کہ کوئی مسلمان گھر سے باہر جھانک کر بھی نہ دیکھے۔ اس کے بعد سکھوں کے جتھے حملہ کرتے اور لوگوں کے گھروں میں یا تو آگ لگا دیتے یا انہیں قتل کر ڈالتے، جو بھاگنے کی کوشش کرتے، ان پر فوج گولیاں برساتی اور جو اندر رہتے وہ جل جاتے یا قتل ہو جاتے۔

چھوٹی چھوٹی بستیوں پر جہاں سے مزاحمت کی توقع بہت کم ہوتی، سکھ فوج کی مدد کے بغیر بھی حملہ کر دیتے تھے۔ رات کے وقت ایک ٹولی گاؤں میں داخل ہوتی اور مٹی کا تیل یا پٹرول چھڑک کر چند گھروں کو آگ لگا دیتی۔ لوگ چیختے چلاتے باہر نکلتے تو ان پر گاؤں کے اردگرد چھپا ہوا جتھہ حملہ کر دیتا۔

سلیم کے گاؤں پر حملہ کرنے والا لشکر جس نے گزشتہ دو دن ارد گرد کی بستیوں میں کوئی قابل ذکر نقصان اٹھائے بغیر نہتوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، اب ایک تلخ حقیقت کا سامنا کر رہا تھا۔ تارا سنگھ اور ٹہیل کے ان سورماؤں کے سامنے لڑنے سے زیادہ قتل کرنے کا پروگرام تھا لیکن ان کے سامنے اب ایک ایسا ہدف تھا جہاں گولیوں کا جواب گولیوں سے ملنے کی توقع تھی۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے ایک سوار گھوڑا بھگاتا ہوا مکان کے پچھواڑے کی طرف نمودار ہوا۔ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر اس نے گھوڑا روکا اور ایک لمحہ توقف کے بعد اپنا ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

نچلی چھت پر مٹی کی بوریوں کے مورچوں میں بیٹھے ہوئے آدمی اس کی طرف اپنی رائفلیں سیدھی کر کے بالا خانے سے مجید کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔

سوار وہی تھانیدار تھا جو ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد علاقے میں اکال سینا کے جتھیدار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر بلند آواز میں کہا۔ ”میں صوبیدار مجید سے بات کرنے آیا ہوں!“

مجید نے منڈیر سے باہر جھانک کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ آگے مت آؤ، وہیں سے بات کرو!“

جتھیدار نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہاتھ خالی ہیں، تم دیکھ سکتے ہو!“

”کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ مجید بولا۔

”میں تمہیں حفاظت سے پاکستان تک پہنچانے کے لیے فوج لے کر آیا ہوں۔ تم

اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دو تو تمہاری جانیں بچ سکتی ہیں۔ ورنہ تم دیکھ سکتے ہو کہ کالی سینا کے دو ہزار آدمی چند منٹ میں تمہارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تم فوج کو لے جاؤ اور کالی سینا کے ساتھ ہم نپٹ لیں گے!''

جتھیدار نے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم بہت ضدی ہو لیکن اگر تم نے جتھے کا مقابلہ کیا تو شاید فوج بھی تم پر حملہ کر دے۔ تم جانتے ہو کہ تم زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''میں جانتا ہوں کہ فوج جتھے کی راہنمائی کے لیے آئی ہے!''

''صوبیدار! یہ غلط ہے۔ فوج کو میں لایا ہوں اور اس لیے لایا ہوں کہ تمہارے خاندان نے اس سے پہلے علاقے کے سکھوں کی حفاظت کی ہے، تمہارے آدمیوں نے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے اپنی بندوقیں بھی میرے حوالے کر دی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ کل مجھے بہت دیر کے بعد اطلاع ملی، ورنہ میں کل بھی سکھوں کو حملہ کرنے سے روکتا!''

''تم کل رام چند کے گاؤں میں انہیں روکنے کے لیے گئے تو تھے؟''

جتھیدار بدحواس ہو کر مجید کی طرف دیکھنے لگا اور پھر سنبھل کر بولا۔ ''آخر تم کب تک مقابلہ کرو گے۔ باؤنڈری فورس کا کوئی مسلمان سپاہی اس علاقہ میں نہیں!''

''ہم ان کا انتظار کریں گے۔''

''صوبیدار! میں سمجھتا تھا کہ تم سپاہی ہو اور بے فائدہ اپنے آدمیوں کی جانیں

گنوانا پسند نہیں کرو گے۔ فوج تمہیں چند منٹ کے اندر اندر ختم کر دے گی اور اس کے بعد عورتوں اور بچوں کا انجام بہت ہی برا ہو گا۔ فوج کا کپتان تمہیں اپنا ''ورڈ آف آنر'' دینے کے لیے تیار ہے۔ کہو تو میں بھی گرنتھ پر ہاتھ رکھ کہہ تمہاری حفاظت کا ذمہ لینے کو تیار ہوں!''

مجید لے مدرے سختی سے کہا۔ ''تم یا تو خود احمق ہو یا مجھے احمق سمجھتے ہو۔ جاؤ اپنے کپتان سے کہو کہ ہم پیٹھ پر گولیاں کھانے کی بجائے انہیں اپنے سینوں پر روکنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اسے کہو کہ میں اپنے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار کو ساری سکھ قوم کے وارڈ آف آنر پر ترجیح دوں گا!''

جتھے دار نے گھوڑے کی باگ موڑ کر ایڑ لگا دی۔ داؤد نے اپنی رائفل اس کی طرف سیدھی کر دی لیکن مجید نے اسے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں داؤد، وہ ایلچی بن کر آیا تھا۔''

جتھے دار کے واپس لوٹتے ہی حملہ آوروں میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور آٹھ دس منٹ کے بعد مکان پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ بارود کی کمی کے پیش نظر مجید اپنے آدمیوں کو ہدایات دے چکا تھا کہ جب تک دشمن ان کی زد میں نہ آئے، وہ فائر نہ کریں۔ چنانچہ کوئی ایک گھنٹے تک انہوں نے حملہ آوروں کی گولیوں کا جواب نہ دیا۔

سلیم چند آدمیوں کے ساتھ مسجد کا مورچہ سنبھالے ہوا تھا۔ اچانک اسے ساتھ والے کھیت میں گنوں کے پتے ہلتے ہوئے دکھائی دیے۔ اپنے ساتھیوں کو اس

طرف متوجہ کرنے کے بعد اس نے ایک کنکر اٹھا کر باہر کی حویلی میں مویشیوں کے ایک کمرے کی چھت پر پھینکی۔ وہاں سے چند آدمی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس نے ہاتھ سے کھیت کی طرف اشارہ کردیا، انہوں نے اگلی چھتوں پر یہ اطلاع پہنچا دی۔ مجید نے بالاخانے کی چھت سے یہ اندازہ لگایا کہ گنوں کے کھیتوں کی طرف سے حملہ آوروں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس طرف آ رہی ہے۔ وہ داؤد کو چند ہدایات دینے کے بعد بالائی منزل کی چھت سے نچلی چھت پر آ گیا۔ گولیوں کی بارش میں وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کونے پر جا پہنچا جو کھیت سے قریب تر تھا۔ سلیم مسجد کی چھت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجید نے اپنے تھیلے سے دستی بم نکال کر اسے دکھایا اور کھیت کی طرف اشارہ کردیا، اس کے جواب میں سلیم نے بھی اسے دستی بم دکھایا۔

کھیت میں اب پتوں کے ہلنے کے علاوہ ہلکی ہلکی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ اچانک پندرہ بیس آدمیوں کی ایک ٹولی کھیت کی منڈیر پھاند کر ''ست سری اکال'' کے نعرے لگاتی ہوئی آگے بڑھی۔

''فائر!'' مجید بلند آواز میں چلایا۔

دس آدمی کھیت سے باہر نکلتے ہی ڈھیر ہو گئے۔ تین آدمیوں نے آگے بڑھ کر دستی بم پھینکنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ایک آدمی بم پھینکتے پھینکتے سینے میں گولی کھا کر گرا اور بم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھٹ گیا، اس کے ساتھ ہی اڑھائی تین سو آدمی منڈیر کی آڑ سے نمودار ہوئے مجید نے یکے بعد

دیگرے دو دستی بم پھینکے اور وہ پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر چیختے چلاتے پھر کھیت میں جا چھپے۔ مجید کے حکم سے چھت کے مورچوں میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے کھیت میں اندھا دھند فائر شروع کر دیے اور وہاں سے زخمی ہونے والوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ گنوں کے پتوں کی سرسراہٹ اور ٹوٹتے ہوئے گنوں کی آواز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کھیت میں مویشیوں کے ریوڑ بے تحاشا ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔

مسجد کی طرف سلیم کوئی دس گز کے فاصلے پر کھیت کے کونے میں چند آدمیوں کو جمع ہوتے دیکھ چکا تھا۔ جب چھت سے فائر شروع ہوئے تو آدمیوں کی ایک اور ٹولی اس طرف آ گئی۔ پانچ آدمی پیٹ کے بل رینگتے ہوئے کھیت سے باہر نکلے اور اچانک اٹھ کر باہر کی حویلی کی طرف بھاگنے لگے۔ سلیم کے ساتھیوں نے مسجد کی چھت سے ان پر گولیاں برسائیں۔ دو آدمی گر پڑے، لیکن تیسرے نے گرتے گرتے حویلی کے اندر دستی بم پھینک دیا۔ باقی دو آدمیو نے دیوار کے قریب پہنچ کر بم پھینکے۔ ایک بم مویشیوں کے ایک کمرے کی چھت اور دوسرا حویلی کے صحن میں گرا۔ مسجد کی چھت سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور یہ دونوں سکھ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ کھیت میں جمع ہونے والے باقی آدمیوں نے باہر آنے کی جرأت نہ کی۔ کسی نے وہاں سے مسجد کی طرف بم پھینکا لیکن وہ مسجد سے چند قدم دور ہی گر کر پھٹ گیا۔

سلیم نے یکے بعد دیگرے دو بم کھیت میں پھینکے اور ان کے گرتے ہی زخمیوں کی چیخیں اور بھاگنے والوں کا شور سنائی دینے لگا۔

حملہ آوروں کے فوجی مددگار مغرب کی طرف کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر مورچے بنا کر اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ اس کا صرف یہ اثر ہوا کہ چند جوشیلے نوجوان جنھوں نے حویلی سے باہر نکل کر کھیت میں چھپنے والوں کا تعاقب کرنے کی کوشش کی، وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے نہ جا سکے۔

مجید اور ان کے ساتھی فوج کی گولیوں کا جواب دینے کی بجائے زیادہ تر کھیت کی طرف توجہ دے رہے تھے، کھیت میں جہاں بھی کوئی پتا ہلتا، وہ بے دریغ فائر کر دیتے۔ کھیت میں چھپا ہوا ایک سکھ چلا چلا کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ ''گیان سنگھ، کرتار سنگھ، بڈھا سنگھ یہاں سے بھاگ جاؤ، یہ گاؤں کے لوگ نہیں، اس مکان میں بلوچ رجمنٹ کے سپاہی چھپے ہوئے ہیں۔ ہماری فوج اور پولیس خود پیچھے ہے اور ہمیں آگے کر کے مروا رہی ہے!''

اس کا یہ کہنا تھا کہ کھیت میں مختلف اطراف سے ''بلوچ رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ'' کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی میں آس پاس کے تمام کھیتوں میں چھپے ہوئے آدمی اپنے آدمیوں کو یہ پیغام پہنچا رہے تھے۔ ''بلوچ رجمنٹ آ گئی، بلوچ رجمنٹ آ گئی۔ بھاگو یہاں سے۔''

بلوچ رجمنٹ[1] کا نام بموں اور گولیوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر میں اس پاس کے کھیتوں میں زخمیوں کے کراہنے کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

---

[1] جب پاکستان کے حصے کی بیشتر فوج ہندوستان سے باہر پڑی ہوئی تھی تو باؤنڈری فورس میں زیادہ تر بلوچ رجمنٹ مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی تھی۔ جب

مشرقی پنجاب میں وحشت اور بربریت کا طوفان اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا تو شاید ذات باری نے قوم کا تمام دردان مٹھی بھر سپاہیوں کے سینوں میں بھر دیا تھا۔ یہ سپاہی سڑکوں اور راستوں پر پڑے ہوئے زخمیوں کو اٹھاتے تھے۔ شہروں اور بستیوں کے مسلمانوں کو اکال سینا، راشٹر یہ سیوک سنگھ اور ہندوستانی فوج اور پولیس کے محاصرے سے نکالتے تھے۔ پناہ گزینوں کی گاڑیوں اور قافلوں کی حفاظت کرتے تھے۔ انہیں اپنی بھوک، پیاس، نیند اور تھکاوٹ کا احساس نہ تھا۔ وہ اپنی قلیل تعداد کے باوجود ہراساں نہ ہوئے۔ سکھوں کے جتھے انہیں دیکھ کر منتشر ہو جاتے۔ جہاں بلوچ رجمنٹ کے پانچ سپاہی پہنچ جاتے، وہاں تارا سنگھ اور پٹیل کے سورماؤں میں بھگدڑ مچ جاتی لیکن ہندوستان کا ڈیفنس منسٹر ایک سکھ تھا اور باؤنڈری فورس کی تشکیل میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا کہ مسلمان سپاہیوں کی قلیل تعداد بھی تعداد بھی قتل و غارت کے اس پروگرام میں رخنہ انداز نہ ہو جسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مونٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے پٹیل اور تارا سنگھ کی سرپرستی کی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے جس ایثار و خلوص اور عزم و استقلال کا ثبوت دیا اور اس کے کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان کی دوسری افواج باہر نہ ہوتیں تو مشرقی پنجاب میں غیر مسلم فوج، پولیس، اکال سینا، سیوگ سنگھ، پٹیالہ، نابھ کپورتھلہ اور دوسری ہندو اور سکھ ریاستوں کے سپاہیوں کے مکمل اتحاد کے باوجود لاکھوں مسلمانوں کو بھیڑیوں کی طرف قتل نہ کیا جا سکتا۔ انتقال اختیارات میں لارڈ لوئی مونٹ بیٹن کی جلد بازی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ

پاکستان کو اس حصے کا اسلحہ اور فوج مل جانے سے پہلے پہلے ہندوستان کی امن پسند حکومت کے جھنڈے کو مسلمانوں کے خون میں تیرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

اچانک کا کوئی عیسائی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پھاٹک کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ ''ایک جتھہ سکھوں کے محلے کی گلی سے اس طرف آ رہا ہے۔'' حویلی کے اندر جمع ہونے والے آدمیوں نے آن کی آن میں یہ اطلاع مجید تک پہنچا دی۔ وہ پانچ مسلح آدمیوں کو ساتھ لے کر باہر نکلا اور گلی کے موڑ پر سکھوں کے ایک خالی مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ دو آدمی بندوقوں کے ساتھ پہلے ہی اس جگہ پہرا دے رہے تھے۔ مجید نے اپنے تھیلے سے دستی بم نکالے اور ایک ایک بم اپنے ساتھ آنے والوں میں تقسیم کرنے کے بعد کہا۔ ''تم گلی کے اگلے موڑ پر منڈیر کی آڑ میں لیٹے رہو۔ جب تک میں پہل نہ کروں تم بم مت پھینکنا۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ آگے نکل جائیں۔ ہمارے پاس بہت تھوڑے بم ہیں۔ اس لیے جہاں رائفلیں کام دے سکیں وہاں انہیں استعمال نہ کرو۔''

یہ ہدایات دے کر مجید ان دو آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا جو صبح سے وہاں پہرا دے رہے تھے۔ ''تمہیں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا؟''

ایک آدمی نے جواب دیا۔ ''تھوڑی دیر ہوئی ایک آدمی بیلا سنگھ کے مکان کی چھت کی چھت پر کھڑا ہو کر یہ کہہ رہا تھا۔ ''اس طرف کوئی نہیں۔'' ہم منڈیر کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔''

مجید نے کہا۔ ''اس نے اگر تمہیں دیکھ نہیں لیا تو وہ گلی کے راستے ضرور آئیں

گے۔''

کوئی پانچ منٹ کے بعد مجید کو گلی میں کچھ فاصلے پر پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے چھت سے سر اٹھا کر دوسرے موڑ کی چھتوں پر لیٹے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور مجید نے اس کے اشارے کا جواب دینے کے بعد پھر اپنا سر نیچے کر لیا اور اپنے قریب لیٹے ہوئے آدمیوں سے کہا۔'' ہوشیار رہو۔ انشاء اللہ ہم اب سب کو ختم کر دیں گے۔ میرے خیال میں ان کے ساتھ فوج کے سپاہی نہیں ہیں ورنہ یہ چھتوں پر قبضہ کرنے سے پہلے گلی میں نہ گھستے۔''

پاؤں کی آہٹ قریب آ چکی تھی۔ کوئی دو سو کے قریب سکھ دبے پاؤں چلتے ہوئے دونوں موڑوں سے آگے نکل گئے۔ اچانک پیچھے سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کی ایک ٹولی آئی اور کسی نے بلند آواز میں کہا۔'' آگے مت جاؤ۔ آگے مت جاؤ۔ وہاں بلوچ رجمنٹ ہے۔''

''بلوچ رجمنٹ۔ بلوچ رجمنٹ۔'' گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ آواز پہنچ گئی۔ سکھ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

مجید نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور ایک نوجوان نے گلی میں پچھلی طرف چند قدم دور دستی بم پھینک دیا اور باقی آدمیوں نے رائفلوں سے فائر شروع کر دیے۔ جتھے کے جو آدمی پیچھے تھے، وہ ''بلوچ رجمنٹ کے نعرے لگاتے ہوئے الٹے پاؤں بھاگے اور جو آگے تھے وہ یہ سمجھ کر کہ بلوچ رجمنٹ پیچھے سے آ رہی ہے۔ ایک

دوسرے کو دھکیلتے اور شور مچاتے ہوئے آگے کی طرف بھاگے۔ مجید کے ساتھی چھتوں پر سے گولیاں برساتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ جب وہ دوسرے موڑ سے آگے نکلے تو مجید نے ایک بم پھینک دیا اور اس کے ساتھ باقی دو آدمیوں نے بھی فائر شروع کر دیے۔

سکھ بڑ کے نیچے کھلی جگہ پر پہنچے تو سلیم نے مسجد کی چھت سے دستی بم پھینکا۔ اس کے ساتھیوں نے فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی برچھیوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح مسلمانوں کا ہجوم حویلی کی دیوار پھاند کر ان پر ٹوٹ پڑا اور آن کی آن میں لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ چند سکھوں نے حویلی کے شمال کی طرف سے گلی کے راستے بھاگنے کی کوشش لیکن بالا خانے سے داؤد نے ایک دستی بم پھینکا اور دوسرے آدمیوں نے نچلی چھت سے اینٹیں برسانا شروع کر دیں۔ پچاس سکھ بدحواسی کی حالت میں جوہڑ میں کود پڑے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو گولیوں سے بچ کر دوسرے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

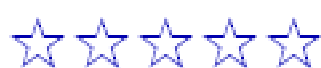
دوسرے طرف ملٹری اور پولیس اصل محاذ سے منہ پھیر کر اکال سینا کی منتشر ٹولیوں کو جمع کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہی تھی۔ جتھیدار انہیں پنتھ کی عزت کا واسطہ دے رہا تھا۔ فوجی انہیں بزدلی کے طعنے دے رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے گاؤں سے ایک میل دور جمع ہوئے۔ سکھ کپتان اور جتھیدار گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کے لیے تیار تھے کہ اس علاقے میں بلوچ رجمنٹ کا ایک سپاہی بھی نہیں آیا لیکن سکھ ان کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نہنگوں کے جتھے کا لیڈر

بہت جوش میں تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ ''ہم نے فوج کی بزدلی کی وجہ سے نقصان اٹھایا ہے۔'' ابھی بحث ہو رہی تھی کہ گلی کے راستے حملہ کرنے والے جتھے کے بچے کھچے آدمی بھی ان کے ساتھ آ ملے۔

ان میں سے ایک آدمی نے جس کے دو بھائی مارے جا چکے تھے، اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کپتان صاحب! تم کہتے ہو کہ ان کی حویلی میں بلوچ رجمنٹ کا کوئی سپاہی نہیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ سکھوں کے تمام گھروں پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ ہم وہاں کئی سو لاشیں چھوڑ کر آئے ہیں۔'' اس کے ساتھیوں نے اس بیان کی تصدیق کی تو باقی سکھ کپتان اور جتھیدار کے سر ہو گئے۔

ایک گیانی نے کہا۔ ''تم لوگ ہمیں مروا رہے ہو، اگر وہاں بلوچ رجمنٹ نہیں تو تم آگے کیوں نہیں جاتے؟ ہم سینکڑوں آدمی مروا چکے ہیں اور تم ابھی تک ان کے مکان کی دیواروں پر نشانہ بازی کر رہے ہو!''

کپتان نے جھلا کر کہا۔ ''میں گورو گرنتھ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ صرف دو گھنٹے کے اندر اندر اس گاؤں کو مٹی کا ڈھیر بنا دوں گا۔ میں اپنے آدمیوں کو مشین گن اور مارٹر لانے کے لیے بھیج رہا ہوں۔



دوپہر کے وقت سکھ گولیوں کی زد سے دور درختوں اور جھاڑیوں کی چھاؤں میں جمع ہو رہے تھے، فوج اور پولیس کے سپاہی اپنے مورچوں میں بیٹھ کر اکا دکا گولیاں

برسا رہے تھے۔ مجید بالا خانے کی چھت سے ایک جیپ کو واپس جاتے دیکھنے کے بعد کافی پریشان تھا۔ اس کے ساتھی جو ادھر ادھر پڑے ہوئے زخمیوں کی تین اسٹین گنیں، چار رائفلیں اور آٹھ دستی بم حاصل کر چکے تھے، اپنی گزشتہ کامیابی پر بہت خوش تھے۔

پانچ بجے کے قریب سلیم مسجد کی چھت سے اتر کر مجید کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

''مجید ایک جیپ واپس چلی گئی ہے۔''

ہاں میں نے دیکھ چکا ہوں۔ اب وہ بہت کچھ لے کر آئیں گے، اب ہماری جنگ سکھوں سے نہیں بلکہ ہندوستان فوج سے ہوگی اور ان سے بعید نہیں کہ وہ ہمارے مکان کو اس علاقے کا سٹالن گراڈ سمجھ کر ٹینک اور ہوائی جہاز بھی میدان میں لے آئیں۔''

سلیم نے کہا۔ ''شاید مسلمان سپاہیوں کا کوئی دستہ اس طرف آ نکلے۔''

داؤد بولا۔ ''اگر اس بات کا کوئی امکان ہوتا تو وہ اس طرح اطمینان سے بیٹھ کر فائر نہ کرتے۔ اب ہم کب تک لڑیں گے!''

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جب تک فتح حاصل نہیں ہوتی۔''

داؤد ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ مجید کی طرف دیکھنے لگا۔

مجید پھر بولا۔ ''میں سچ کہتا ہوں داؤد۔ میں آخری فتح کے لیے لڑ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ فتح کب ہوگی، کہاں ہوگی، لیکن میرا ایمان ہے کہ وہ جھنڈا جو ہم نے چچا اسماعیل کی قبر کے سرہانے گاڑا ہے، کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔ داؤد تمہیں یاد ہے

، ایک دفعہ سکول میں میری اور تمہاری لڑائی ہوئی تھی۔ میں تم سے کمزور تھا لیکن مار کھانے کے باوجود میں پیچھے نہ ہٹا، بالآخر میری ضد نے تمہیں پریشان کر دیا۔''

داؤد نے کہا۔ ''کاش! ہماری قوم بھی اس قدر ضدی ثابت ہو!''

سلیم نے کہا۔ ''قوم کو اپنی بقا کے لیے ضدی بننا پڑے گا!''

مجید نے سوال کیا۔ ''سلیم ہمارے آدمی بہت پریشان تو نہیں؟''

''پریشان تو ہیں، وہ بار بار پوچھتے ہیں کہ اب کیا ہوگا؟''

''انہیں کہو اب لڑائی ہوگی!''

سلیم نے کہا۔ ''بعض آدمی یہ کہہ رہے ہیں کہ شاید بٹالہ میں مسلمان سپاہیوں کا کوئی دستہ ہو، ہمیں وہاں اطلاع بھجوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

مجید بولا۔ ''بٹالہ کے اردگرد مسلمانوں کے سینکڑوں گاؤں میں۔ یہ طوفان جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں، وہاں بھی ہوگا۔ اگر وہاں مسلمان سپاہی ہوئے بھی تو وہ ہم سے زیادہ نہتے اور بے بس مسلمانوں کو چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔ تم گھبرا تو نہیں گئے سلیم؟''

سلیم کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کی پیشانی کی رگ ابھر آئی۔ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''نہیں مجید میں گھبراتا نہیں۔ ہماری رگوں میں ایک ہی دادا کا خون ہے۔ میں تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ ہم دشمن کو زیادہ تباہی کا موقع دینے کا بجائے ان پر حملہ کیوں نہ کر دیں۔ اس وقت لوگوں کے حوصلہ بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم حملہ کر کے فوج کے سپاہیوں کو مار بھگائیں تو جتھا دوبارہ اس طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ مجھے اجازت دو میں چند آدمیوں کے ساتھ شمال کی طرف سے کھیتوں میں چھپ کر ان کے مورچے

پر حملہ کرتا ہوں۔ تم انہیں فائر کر کے اپنی طرف متوجہ رکھو۔“

مجید نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”سلیم! بعض اوقات مورچے کے اندر بیٹھ کر لڑنا، باہر نکل کر حملہ کرنے سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں میرا بھائی سینے پر گولی کھا سکتا ہے لیکن آج بہادری کی بجائے تمہارے صبرو استقلال کا امتحان ہے۔ آج جوش سے زیادہ ہمیں ٹھنڈے دماغ کی ضرورت ہے۔ فرض کرو کل ہم یہاں پہنچتے ہی دشمن پر ٹوٹ پڑتے اور تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ سلیم ہمارے پاس بندوقیں چلانے والے آدمی بہت کم ہیں، بارود بہت تھوڑی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری ایک گولی بھی رائیگاں جائے۔ ہمارا پہلا اور آخری مقصد زیادہ سے زیادہ دیر تک اس مورچے کی حفاظت ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”لیکن اگر فوج سچ مچ مارٹر یا آرمرڈ کاریں لے کر آ گئی تو؟“

مجید نے جواب دیا۔ ”ہم لڑیں گے۔ ہم ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر لڑیں گے۔ ہم گرتی ہوئی چھتوں پر لیٹ کر فائر کریں گے!“

داؤد نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟“

”تمہیں ابھی تک معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ دیکھو ہماری وجہ سے دو اڑھائی ہزار آدمیوں کا جتھا اور فوج کے چالیس پچاس آدمی وہاں رکے ہوئے ہیں۔ اگر ہم انہیں نہ روکتے تو یہ صبح سے اب تک مسلمانوں کی کتنی بستیاں تباہ کر چکے ہوتے۔ وہ گولیاں جو ہمارے مکان کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہیں، ہزاروں بچوں عورتوں اور بوڑھوں کے سینے چھلنی کرتیں۔ ہم اس طوفان کو روک کر اس علاقے کے ہزاروں

مسلمانوں کو پاکستان کی طرف بڑھنے کا موقع دے رہے ہیں۔ تم سن چکے ہو کہ بیاس کے اس پار سے بھی مسلمانوں کے قافلے آ رہے ہیں۔ اگر ہم انہیں چند گھنٹے اور روک سکیں تو وہ راوی تک پہنچ جائیں گے۔"

سلیم نے کہا۔ "مجید! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اگر موقع ملے تو ہم رات کے وقت سکھوں کے کسی گاؤں پر جوابی حملہ کر دیں۔"

مجید نے مسکرا کر کہا۔ "اب تم ایک سپاہی کی طرف بات کر رہے ہو۔ ہم یقیناً حملہ کریں گے۔ بادل آ رہے ہیں، خدا کرے رات کے وقت آسمان صاف نہ ہو۔"

نچلی چھت سے بشیر نے آواز دی۔ "مجید سڑک پر دو جیپیں آ رہی ہیں۔"

مجید، داؤد اور سلیم گھٹنوں کے بل نیچے ہو کر منڈیر کے اوپر سے جھانکنے لگے۔ جیپیں سڑک سے اتر کر گاؤں کا رخ کر رہی تھیں۔ مجید نے کہا۔ "سلیم! تم سب اپنے اپنے مورچوں میں جاؤ۔



جیپیں مکئی کے کھیت کے پیچھے رکیں اور سپاہیوں نے اترتے ہی مارٹروں کے ساتھ گولہ باری شروع کر دی۔ جتھے کے آدمی جو دور دور بیٹھے ہوئے تھے، اٹھ کر مختلف ٹولیوں میں ادھر ادھر پھیل گئے۔ مورچوں میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں سے پندرہ آدمی اٹھ کر جتھے والوں کی ٹولیوں کے ساتھ جا ملے۔

ایک گھنٹہ کی بے تحاشا گولہ باری سے وہ دونوں حویلیوں کے چند کمروں کو پیوند

زمین کر چکے تھے، بعض دیواروں اور چھتوں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے دو کمروں کی چھتیں اڑ گئی تھیں اور مرد زخمیوں کو نکال رہے تھے۔

مجید نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''داؤد ابھی چھ بجے ہیں ہم شام کے اندھیرے میں حملہ کر کے ان کے مارٹر چھین سکیں گے۔ اگر مکئی کا وہ کھیت الگ تھلگ نہ ہوتا تو میں اس وقت بھی کوشش کرتا۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''شام تک شاید ان مکانوں کی کوئی دیوار بھی سلامت نہ رہے!''

حویلی کے صحن میں یکے بعد دیگرے چند بم گرنے سے آدمیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہاں سے بھاگو! یہاں سے بھاگو! بعض آدمی کمروں کے دروازے کھول کھول کر عورتوں اور بچوں کو آوازیں دینے لگے۔ ایک جگہ دیوار میں شگاف پڑ گیا تھا۔ چیختے چلاتے آدمیوں کا ایک ہجوم باہر نکلا تو مسجد کی چھت سے سلیم چلایا۔ ''اس طرف مت آؤ، پیچھے ہٹ جاؤ۔'' لوگوں نے اس کی آواز نہ سنی لیکن سکھوں کے ایک مکان کی چھت سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں الٹے پاؤں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

مجید بالا خانے کی چھت سے نچلی چھت پر آ کر چلا رہا تھا۔ ''لیٹ جاؤ، خدا کے لیے زمین پر لیٹ جاؤ!''

جنوب کی طرف مویشیوں کا ایک کمرہ گر جانے سے گنوں کے کھیت کی طرف نکلنے کا راستہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب حویلی میں چند اور بم گرے تو لوگ بدحواس ہو کر اس راستے سے نکلنے لگے۔ فوج نے اپنے مورچے سے گولیوں کی بوچھاڑ کی اور کئی

عورتیں اور بچے ڈھیر ہو گئے۔

سلیم چلایا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ! پیچھے ہٹ جاؤ!''

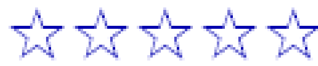
مجید نیچے اتر کر بھاگتا ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے قمیص کی بائیں آستین خون سے بھیگی ہوئی تھی۔ خوف سے چیختی چلاتی عورتیں اور بچے اور زخموں سے کراہتے ہوئے آدمی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

مجید نے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو تم مفت میں جانیں گنوا رہے ہو۔ خدا کے لیے آس پاس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لیٹ جاؤ!''

لوگوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ایک کمسن لڑکی مجید کے پاؤں کے قریب لیٹ گئی۔ مجید نے اسے اٹھا کر کھرلی میں لٹا دیا اور پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''دیکھو، اگر ہمیں کسی کے بچ نکلنے کی امید ہوتی تو میں تمہیں منع نہ کرتا۔ انہوں نے چاروں طرف سے گاؤں کو گھیر رکھا ہے۔ ہمیں شام کی تاریکی کا انتظام کرنا پڑے گا۔ بندوقیں چلانے والے چند آدمی زخمی ہو گئے ہیں۔ تم میں سے جو بندوقیں چلانا جانتے ہیں، وہ میرے ساتھ آئیں اور باقی اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔''

ایک چار سالہ بچہ اٹھ کر آگے بڑھا اور اپنی توتلی زبان میں بولا۔ ''تھو بیدار تم بھی تھکوں کو دولے مارو نا۔ وہ دولے مارتے ہیں۔ تم کیوں نہیں مارتے؟''

''ہم بھی ماریں گے۔'' مجید نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ لوگ اس آہنی انسان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے تھے۔ جو گولیوں اور بموں کی بارش میں کھڑا مسکرا سکتا تھا۔



شام کے ساتھ بجے یہ لوگ شکستہ چھتوں پر چڑھ کر اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کی آڑ لے کر دشمن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ سکھوں نے یہ سمجھ کر حملہ کیا تھا کہ ان کی قوت مدافعت گرے ہوئے مکانوں کے ملبے کے اندر دب چکی ہے لیکن مسلمانوں نے پھر ایک بار حرارت ایمانی کا ثبوت دیا اور حملہ آور پیچھے ہٹ گئے۔

یوسف بم کے ریزے لگنے سے بری طرح مجروح ہو چکا تھا اور گھر کی عورتیں اسے اٹھا کر دالان کے اندر لے گئی تھیں۔ دالان کی چھت کے ایک کونے میں شگاف ہو چکا تھا۔

جوں جوں شام نزدیک آ رہی تھی، حویلی کے گرد حملہ آوروں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مسجد کی ایک دیوار ٹوٹ چکی تھی اور اس کے ساتھ چھت کی چند کڑیاں بھی نیچے گر چکی تھیں۔ چھت کے دوسرے کونے میں سلیم اور اس کے ساتھ ابھی تک اپنے مورچے کے اندر ڈٹے ہوئے تھے۔

مجید چند آدمیوں کے ساتھ حملے کی تیاریاں کرنے کے بعد باقی آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اچانک سلیم نے آواز دی۔ ''مجید سڑک کی طرف سے ایک چھوٹا سا ٹینک آ رہا ہے!''

تھوڑی دیر کے لیے مجید کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ٹینک نہیں ہو سکتا۔ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔''

داؤد نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''نہیں مجید تم ٹھہرو، میں درخت پر چڑھ کر دیکھتا ہوں

داؤد باہر نکل کر بڑ کے درخت پر چڑھا اور وہیں سے بولا۔ ''شاید برین کیریر ہے۔''

مجید اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''اب ہم شام کی تاریکی کا انتظار نہیں کر سکتے۔''

اوپر سے داؤد پھر بولا۔ ''فوج کے سپاہی برین کیریر کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ اسے ڈھال بنا کر یہاں تک پہنچیں گے!''

مجید بولا۔ ''داؤد تم جلدی نیچے اتر آؤ۔''

داؤد اور فوج کے دوسرے تربیت یافتہ آدمیوں سے تھوڑی دیر مشورہ کرنے کے بعد مجید نے کہا۔ ''میں صرف چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتا ہوں۔ سٹین گنیں ہمیں دے دو۔ ہم برین کیریر کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ تم سب یہیں رہو اور یاد رکھو، بہادری کی موت بزدلی کی موت سے بہتر ہے۔ سکھوں کا یہ حملہ آخری ہو گا۔ اگر ہم نے انہیں پسپا کر دیا تو رات کے وقت یہاں سے چند آدمیوں کے زندہ بچ کر نکل جانے کا امکان ہے۔ جب تک میں واپس نہیں آتا، میری جگہ جمعدار عنایت علی لے گا!''

عنایت علی دن بھر کی لڑائی میں یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ حکم ماننا اور حکم دینا جانتا ہے۔



ایک بکتر بند گاڑی گنوں کے کھیت کے قریب سے گزر رہی تھی اور پندرہ بیس پیادہ سپاہی اس کے پیچھے پیچھے پیدل آ رہے تھے۔ جونہی گاڑی کھیت کے ایک کونے کے پاس پہنچی، مجید تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کھیت سے باہر نکلا۔ دو آدمیوں نے فائر کیے، ایک گولی مجید کی ران اور دوسری بازو میں لگی لیکن اتنی دیر میں اس نے گاڑی کے قریب پہنچ کر بم پھینکا اور زمین پر لیٹ گیا۔ بم کیریر کے اوپر پڑا۔ پیشتر اس کے کہ اس کے ساتھ پیدل آنے والے آدمی مجید کی طرف متوجہ ہوتے، داؤد اور دوسرے آدمی نے جو کھیت کی منڈیر کے پیچھے لیٹے ہوئے تھے، سٹین گنوں سے گولیوں کی بارش شروع کر دی اور چند سیکنڈ میں سات آٹھ آدمی ڈھیر کر دیے۔ مجید نے لیٹے لیٹے دوسرا بم پھینکا اور پسپا ہونے والے آدمیوں میں سے تین کو اور گرا لیا۔ باقی آدمی بھاگ کر پندرہ بیس گز دور پانی کی کھائی میں لیٹ گئے۔ بکتر بند گاڑی بے تحاشا ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ مورچے میں بیٹھے ہوئے چند آدمی اٹھ کر گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے۔ گاڑی کوئی دو سو گز شیشم کے درختوں کے ایک جھنڈ میں جا پھنسی۔ پانی کی کھائی میں لیٹے ہوئے سپاہی مجید کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ کھیت سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر مجید کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے زمین پر سر ٹیک دیا۔

داؤد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''مجید زخمی ہے، میں جاتا ہوں، تم ان پر فائر کرتے رہو۔''

داؤد زمین پر رینگتا ہوا مجید کے قریب پہنچا۔ مجید چلایا۔ ''داؤد تم جاؤ وقت ضائع

نہ کرو۔" لیکن داؤد نے اس کا بازو پکڑ کر اس کی بغل میں اپنا سر دے دیا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ چند گولیاں مجید کے سر کے بالوں چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ ایک گولی داؤد کے بازو کے ساتھ مس کرتی ہوئی گزر گئی۔ جونہی وہ کھیت میں داخل ہوئے، سکھ شور مچانے لگے۔ "دیکھو وہ صوبیدار ہے، بھاگنے نہ پائے۔ اس کا پیچھا کرو!"

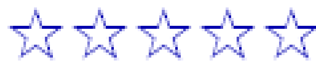
تھوڑی دیر میں آس پاس سے جتھے کے آدمیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "صوبیدار کھیت میں ہے۔ دیکھو نکلنے نہ پائے!"

داؤد نے مجید کو اٹھا کر اپنی کمر پر ڈال لیا اور اپنے ساتھی سے کہا۔ "تم یہیں سے پانچ منٹ تک اکا دکا فائر کرتے رہو!"

داؤد کو چاروں طرف سے آدمیوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور مجید کو لٹانے کے لیے اسے کوئی جگہ بھی محفوظ نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ گنوں کے ایک کھیت سے نکل کر دوسرے اور تیسرے کھیت میں جا پہنچا۔ مجید کہہ رہا تھا "داؤد! خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، تم جاؤ۔" لیکن وہ چلتا رہا۔ رہٹ کے قریب پہنچ کر امرود کے باغ کے آس پاس خاموشی تھی، داؤد نے اسے وہاں اتار کر زمین پر لٹا دیا اور اپنی پگڑی پھاڑ کر اس کی ران اور بازو پر پٹیاں باندھ دیں۔

اچانک مجید چلایا۔ "سنو بے وقوف! وہ مشین گن چلا رہے ہیں۔ کاش ہم برین کیریر پر قبضہ کر سکتے!"

داؤد نے اٹھ کر اپنی اسٹین گن اٹھائی اور گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔



مجید اور داؤد کے باہر نکلتے ہی لوگ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ صورتحال خطرناک ہے۔ عنایت علی نیم شکستہ چھت سے بکتر بند گاڑی پر داؤد اور مجید کے حملے کے نتائج دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی بے قابو ہو کر درختوں میں جا پھنسی تو وہ ”آفرین! آفرین!!“ کہتا ہوا نیچے اترا اور سہمے ہوئے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”دشمن کا سب سے بڑا ہتھیار بے کار ہو چکا ہے، اب تم جوابی حملے کے لیے تیار ہو جاؤ!“

دوسری طرف سلیم اور اس کے ساتھی نعرے لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے دشمن کے مارٹروں پر بھی خاموشی چھا گئی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ سب سے بڑا خطرہ ٹل چکا ہے لیکن دس منٹ کے بعد گولہ باری پھر شروع ہو گئی۔ اچانک سلیم نے آواز دی۔ ”ہوشیار! ہوشیار! وہ پھر آ رہا ہے۔“

عنایت علی دوبارہ بھاگتا ہوا چھت پر چڑھا، برین کیریر کو واپس آتے دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لیے مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ کیریر کے پیچھے آدمیوں کا ہجوم نعرے لگاتا ہوا آ رہا تھا۔ عنایت علی نے مڑ کر آس پاس کی دیواروں اور چھتوں سے باہر جھانکنے والے آدمیوں کو دیکھا اور بلند آواز میں کہا۔ ”ہمیں ہر وقت پر اسے روکنا ہے۔“ اس نے سیڑھی کے راستے نیچے اترنے کی بجائے ساتھ والے کمرے کے ملبے کے ڈھیر پر چھلانگ لگا دی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بم گرا اور آن کی آن میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک یہ آواز پہنچ گئی۔ ”جمعدار شہید ہو گیا ہے۔“ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

آفتاب ٹوٹے ہوئے بازوؤں اور ڈوبتے ہوئے حوصلوں کا آخری منظر دیکھنے کے بعد روپوش ہو چکا تھا۔شام کے دھندلکے پر رات کی سیاہی غالب آرہی تھی۔ بکتر بند گاڑی مشین گن سے آگ کے شعلے اگلتی ہوئی آگے بڑھی۔''پنتھ کی جے، خالصتان کی جے، واہگورو جی کی فتح'' کے نعرے بلند ہوئے۔ حملے کا بگل بجا اور وحشت اور بربریت کا سیلاب چاروں طرف سے پھوٹ نکلا۔

اقوام ایشیا کی راہنمائی کا دعویٰ کرنے والی سلطنت کی سرپرستی میں لڑنے والا لشکر بالآخر اپنے حریف پر غالب آچکا تھا۔سکھوں کی کرپانوں کے لیے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی گردنوں تک پہنچنے کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ہندوستانی فوج کے سورما نہتوں کے سینوں کو اپنی گولیوں کا ہدف بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

حویلی کے اندر داخل ہونے والے حملہ آور ادھر ادھر بھاگتے ہوئے لوگوں کا قتل عام کررہے تھے۔گاؤں کی تمام گلیوں کے راستے بند پا کر بھاگنے والے گنوں کے کھیت کا رخ کررہے تھےلیکن بہت کم ایسے تھے جو مشین گن کی گولیوں سے بچ کر نکل سکے۔

مسجد کی چھت سے سلیم اور اس کے دوساتھیوں کی گولیاں پھاٹک کی طرف سے آگے بڑھنے والوں کو روکے ہوئے تھیں لیکن سلیم کے تھیلے میں صرف چند گولیاں باقی تھیں۔اس نے میگزین میں آخری راؤنڈ بھرنے کے بعد سنگین چڑھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔''میرے پاس صرف ایک دستی بم ہے۔میں برین کیریر پر حملہ کرنے جارہا ہوں۔جب تک وہ بیکار نہیں ہوتا، سکھ میدان نہیں چھوڑیں

گے!''

سلیم کے ایک ساتھی نے کہا۔ ''تمہیں جان گنوانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا!''

''اب میری جان کی کیا قیمت ہے؟''

''لیکن تم کیسے اترو گے؟ سکھ چاروں طرف سے ہماری تاک میں ہیں۔ تم صرف گنوں کے کھیت کی منڈیر کے پیچھے چھپ کر وہاں تک پہنچ سکتے ہو لیکن مشین گن کے فائر میں تم کھیت تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''میں جوہڑ کے کنارے کنارے سرکنڈے کی آڑ لے کر جا سکتا ہوں۔ مجھے اپنی پگڑی دو!''

ایک ساتھی نے اپنی پگڑی اتار دی اور سلیم نے جلدی سے ماجھے کے سکھوں کی طرح ڈھاٹا باندھ لیا۔

دوسرے ساتھی نے سوال کیا۔ ''تم اترو گے کیسے؟ وہ تمہیں دیکھتے ہی فائر کر دیں گے۔'' سلیم اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پیٹ کے بل رینگتا ہوا مٹی کی بوریوں کے مورچے سے نکلا اور چھت کے دوسرے کونے میں شگاف کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''رحیم بخش! میں یہاں سے نیچے کودتا ہوں، تم میری رائفل پگڑی کے ساتھ باندھ کر نیچے لٹکا دو!''

''نہیں سلیم! تم اندر جا کر دروازے کے راستے نکلو گے تو کنوئیں کی منڈیر کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی تم پر حملہ کر دیں گے!''

سلیم کچھ کہنے کو تھا کہ اس کے پاؤں کے پاس کوئی چیز گری۔ ''تم!'' اس کا ساتھی

چلایا اور سلیم نے کسی توقف کے بغیر جھپٹ کر بم پکڑا اور چھت سے نیچے پھینک دیا۔ بم زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی پھٹ گیا۔ اس کے بعد سلیم نے ایک لمحہ کے لیے تذبذب کی حالت میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اچانک ایک کڑی میں ہاتھ ڈال کر اندر لٹک گیا۔ اوپر سے ایک آدمی نے اس کی رائفل پگڑی کے ساتھ باندھ کر لٹکا دی، وہ تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر اسے ڈھونڈ رہا تھا کہ چھت پر ایک دھماکہ ہوا۔ کوئی وزنی شے اس کے سر پر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف جا گرا۔

حویلی میں ابھی تک ایسے سرفروشوں کا گروہ موجود تھا جو آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ لے کر بندوقیں چلا رہے تھے۔ چند آدمی شکستہ چھتوں اور دیواروں کے اوپر لیٹ کر اینٹیں پھینک رہے تھے۔ غلام حیدر نے بلند آواز میں کہا۔ ”مسلمانو! آؤ انہیں دکھا دیں کہ بہادر کس طرح مرتے ہیں اور ”اللہ اکبر“ کا نعرہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی جن میں سے زیادہ تر سکھوں سے چھینی ہوئی کرپانوں اور برچھیوں سے مسلح تھے، باہر نکل کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، ان کے پر جوش حملے نے پھر ایک بار سکھوں کے پاؤں اکھاڑ دیے لیکن یہ بجھتے ہوئے چراغ کی لو تھی۔ فوج کی راہنمائی میں سکھوں کے ایک اور گروہ نے مغرب اور شمال کی سمتوں سے گری ہوئی دیواروں کو عبور کر کے حویلی پر دھاوا بول دیا۔

ایک ٹولی عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے کمروں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہی تھی۔ باہر نکل کر لڑنے والے آدمیوں نے آگ کے شعلے دیکھے تو الٹے پاؤں

مکانوں کی طرف بھاگے۔

وہ چلا رہے تھے۔ ''میری ماں، میری بیوی، میرے بچے، میری بہنیں!'' اور اس کے جواب میں وہ آگ کے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔ آگ می جلنے والوں کی چیخیں سن رہے تھے۔

حملہ آوروں نے ماؤں، بہنوں، بیویوں، بچوں اور زخمیوں کو آوازیں دینے والوں کو تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا لیکن آگ دیر تک جلتی رہی، چیخیں دیر تک سنائی دیتی رہیں اور آگ لگانے والے ان چیخوں کا جواب قہقہوں سے دیتے رہے اور پھر وہ نعرے لگا رہے تھے۔ ''پنتھ کی جے، خالصان کی جے۔''

آسمان پر کہیں کہیں بادل کی پھٹی ہوئی ردا سے جھانکنے والے ستارے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ''پنتھ کی جے'' نہیں ''پٹیل کی جے، خالصتان کی جے'' نہ کہو'' مونٹ بیٹن'' اور'' ریڈ کلف کی جے'' کہو!



سلیم نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں۔ وہ مسجد کے صحن میں فرش پر لیٹا ہوا تھا اور چند آدمی تاریکی میں جھک جھک کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم، تم کون ہو؟'' اس نے اپنے زخمی سر کو دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔

اس کے جواب میں ایک لڑکی چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ایک لمحہ کے اندر اندر گزشتہ تمام واقعات سلیم کی آنکھوں میں پھر گئے۔ اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے ٹارچ چھین لی اور روشنی میں اپنے گرد جمع ہونے والوں کو ایک نظر دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

حویلی اور اس کے آس پاس مسلمانوں کے تمام گھروں میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے سلیم بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر اچانک بھاگتا ہوا مسجد کے صحن سے باہر نکل گیا۔ حویلی میں جمع ہونے والے آدمی اس کے پیچھے ہو لیے۔ ''سلیم! سلیم! ٹھہرو......!'' وہ اسے آوازیں دے رہے تھے۔

سلیم باہر کی حویلی کے صحن میں پہنچ کر آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کے سامنے رک گیا۔ اندر کی حویلی آگ کا وسیع الاؤ بنی ہوئی تھی۔ عورتوں، بچوں اور زخمیوں سے بھرے ہوئے دالانوں اور کمروں کی رہی سہی چھتیں جل کر نابود ہو رہی تھیں۔ باہر کی حویلی میں آگ کے شعلے، غلے کے گوداموں اور مویشی خانوں کو جلانے کے بعد برآمدے کے چھپر تک پہنچ چکے تھے۔ بڑ کے درخت کے وہ ٹہنے جو باہر کی حویلی کے کونے والے کمروں پر جھکے ہوئے تھے، جل چکے تھے۔ دوسری طرف بھوسے کے گودام اور اس کے ساتھ گنڈیال میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ تمام صحن لاشوں سے پٹا پڑا تھا لیکن یہ لاشیں نہ تھیں، گوشت کے وہ لوتھڑے تھے جن پر حملہ آوروں نے فتح کے بعد اپنی کرپانوں کی تیزی کا امتحان کیا تھا۔ کسی کا سر علیحدہ تھا، کسی کے بازو اور کسی کی ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ ڈیوڑھی کے سامنے ان

عورتوں اور بچوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جنہوں نے جلتے ہوئے مکانوں سے نکل کر باہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

سلیم ایک سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ اس کے گرد جمع ہونے والے آدمیوں میں سے کسی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلیم نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بدستور آگ کے شعلوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے سلیم کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "سلیم! سلیم!!"

یہ مہندر سنگھ تھا۔ اچانک سلیم نے ایک جھرجھری لی اور مہندر کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور چلایا۔ "مہندر! وہ کہاں ہیں؟ وہ سب کہاں گئے؟ میری خاندان کی عورتیں، میری بہنیں، میری چچیاں، میری ماں، ان پر کیا گزری؟ بتاؤ! خدا کے لیے بتاؤ!" وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا لیکن مہندر کے پاس بہتے ہوئے آنسوؤں اور سسکیوں کے سوا ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا۔

کاکو عیسائی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "سلیم وہ سب جل چکے ہیں۔ تمہارے خاندان کوئی بچہ اور عورت باہر نہیں نکلی، جب انہوں نے مکانوں پر دھاوا بولا تھا، میں بڑ کے درخت کے اوپر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ آگ لگنے کے بعد جو عورتیں اور بچے کمروں سے نکل کر ادھر ادھر بھاگے تھے، انہیں سکھوں نے یا تو قتل کر دیا تھا یا واپس آگ کی طرف دھکیل دیا تھا۔ بہت تھوڑے ایسے تھے جو کھیت تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ کے خاندان کی کوئی عورت یا بچہ باہر نہیں نکلا۔"

مہندر نے کہا۔ ’’میں جتھے کے آدمیوں سے پوچھ چکا ہوں۔ جتھے دار کی خواہش تھی کہ...... تمہارے خاندان...... تمہارے خاندان کی سب عورتیں زندہ پکڑ لی جائیں۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ وہ دروازہ توڑ رہے تھے کہ روشن دان سے کسی نے بندوق سے فائر کیے، ان کے چند آدمی زخمی ہوئے۔ چند چھرے جتھے دار کے منہ پر لگے۔ دو آدمی چھت کے شگاف کے راستے نیچے کودے، انہیں شاید عورتوں نے مار ڈالا۔ اس کے بعد انہوں نے آگ لگا دی۔

سلیم نے دوسرے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے آٹھ دس گاؤں کے عیسائی اور تین باہر کے مسلمانوں تھے جن میں سے ایک وہ سپاہی تھا جس نے بکتر بند گاڑی پر حملہ کرنے کے لیے مجید اور داؤد کا ساتھ دیا تھا۔ ایک نوجوان چند قدم دور سب سے الگ تھلگ کھڑا آگ کے شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’’کون! بشیر؟‘‘ سلیم نے اسے پہچان کر کہا۔

بشیر نے گردن اوپر اٹھائی لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

سلیم آگے بڑھا۔ ’’بشیر! بشیر!! خدا کے لیے بتاؤ کیا وہ سب......؟‘‘ سلیم کی آواز بیٹھ گئی۔

بشیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا اور وہ بے اختیار سلیم سے لپٹ گیا۔ وہ ہچکیاں بھرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ’’سلیم! آؤ اس آگ میں کود پڑیں، اب ہمارے لیے ان انگاروں کے سوا کوئی جگہ نہیں۔ ہم تمام عمر سلگنے کی بجائے ان کی طرح ایک ہی بار کیوں نہ بھسم ہو جائیں۔ دیکھو اب وہاں کوئی فریاد، کوئی چیخ، کوئی آواز سنائی

نہیں دیتی۔ سلیم میں موت سے ڈر کر بھاگا تھا لیکن اب مجھے زندہ رہنے کا خوف ہے۔''

سلیم نے کہا۔ ''بشیر! خدا کے لیے میرے سوال کا جواب دو۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کسی کو پکڑ کر تو نہیں لے گئے؟''

''نہیں، مہندر نے جو کچھ کہا ہے سب درست ہے۔ وہ دروازہ توڑ رہے تھے لیکن قدرت نے ان کی عزت بچالی۔ یوسف زخمی ہو کر ان کے پاس چلا گیا تھا۔ اس نے روشن دان سے فائر کیے اور انہوں نے طیش میں آ کر آگ لگا دی۔ وہ بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہی تھیں۔''

سلیم نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ ''اور ہمارے آدمیوں میں سے بھی کوئی نہیں بچا؟''

بشیر نے جواب دیا۔ ''میں جتھے کے واپس ہوتے ہی مسجد کے ملبے کے ڈھیر میں تمہیں تلاش کرنے لگا تھا ممکن ہے، میری طرح کوئی اور بھی بچ کر نکل آیا ہو۔''

کا کو نے کہا۔ ''داؤد پھاٹک کے پاس دیوار کی اینٹوں کے نیچے دب کر کراہ رہا تھا۔ میں نے درخت سے اتر کر سب سے پہلے اسے نکالا۔ اس نے بتایا کہ صوبیدار زخمی تھا اور میں اسے امرود کے باغ میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ اس کا حال دیکھنے گیا ہے۔''

سلیم نے کہا۔ ''مسجد کی چھت پر میرے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ جب میں اتر رہا تھا۔ تو شاید اوپر بم گرا تھا۔ تم نے انہیں نہیں دیکھا؟''

کاکو نے جواب دیا۔ ''ان کی لاشیں ملبے کے اوپر پڑی ہوئی تھیں اور جتھے والے دیکھ کر چلے گئے۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ تم نیچے دبے ہوئے ہو اور ہم یہ سمجھ کر واپس آ رہے تھے کہ تم بم گرنے سے پہلے کہیں نکل گئے ہو گے لیکن مہندر نے ٹارچ کی روشنی میں تمہاری بندوق کی سنگین دیکھ لی۔''

سلیم نے کہا۔ ''میری بندوق کہاں ہے؟''

''وہ وہیں پڑی ہوئی ہے۔''

نوجوان لڑکی جو چند قدم پیچھے کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی، بندوق کا نام سنتے ہی آگے بڑھی اور ملتجی نگاہوں سے سلیم کی طرف سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بھائی خدا کے لیے اب اپنی جان بچاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مجید کو یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔''

یہ روپا تھی۔ شیر سنگھ کی بیٹی اور گلاب سنگھ کی بہن۔ سلیم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''روپا! تم اپنے گھر جاؤ!''

لیکن روپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ ''تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے تم کتنوں کو مارو گے۔ تم کس کس سے لڑو گے۔ خدا کے لیے اب پاکستان چلے جاؤ۔ رات کے وقت تم نکل سکتے ہو!''

سلیم چلایا۔ ''روپا جاؤ!''

روپا ایک لمحے کے لیے سلیم کی گرجتی ہوئی آواز سے سہم گئی اور پھر آگ کی روشنی میں سلیم کے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے بولی۔ ''سلیم میری التجا ایک بہن کی

التجا ہے۔ اسے مت ٹھکراؤ۔ اگر تم بھی مارے گئے تو اس گھرانے کا نام مٹ جائے گا!
''

ایک سلیم جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ''اب میرا کوئی خاندان نہیں، کوئی گاؤں نہیں، کوئی گھر نہیں، اب میں کسی کا بھائی نہیں۔ اب میں صرف انتقال ہوں!''

مہندر نے کہا۔ ''اگر ایک انسان کا خون اس قوم کے گناہوں کو دھوسکتا تو میں تم سے کہتا، سلیم میری گردن پر چھری پھیر دو۔ میں اپنا بلیدان دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک قوم کے پاپ کا بوجھ ایک قوم ہی اٹھا سکتی ہے میری متعلق تمہیں غلط فہمی نہ ہو۔ میں تم سے ان بھیڑیوں کے لیے رحم کی درخواست نہیں کروں گا۔ اگر تم تنہا بندوق لے کر انہیں ختم کر سکتے تو میں تمہیں روکنے کی بجائے آگے دھکیلتا لیکن تم جانتے ہو کہ تم تنہا اس طوفان کو نہیں روک سکتے۔ سلیم اب تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر یہ رات گزر گئی تو شاید تمہیں موقع نہ ملے۔ مجید زخمی ہے۔ کم از کم تم اسے بچا سکتے ہو۔ مجید کے لیے میں تمہیں اپنا گھوڑا دے سکتا ہوں، تم اگر ہمت کرو تو صبح تک راوی عبور کر سکو گے۔''

گاؤں کے ایک عیسائی نے کہا۔ ''ان کے تین گھوڑے سارا دن ادھر ادھر بھاگتے رہے ہیں، ان کے ساتھ کسی کا ایک اور گھوڑا بھی ہے!''

...... دوسرے آدمی نے کہا۔ ''میں نے انہیں ابھی دیکھا ہے۔ وہ مسجد کے قریب جامن کے درختوں کے پاس کھڑے تھے۔''

سلیم نے مہندر کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر ایک بار شعلوں کی طرف دیکھ رہا

تھا۔۔۔۔۔اچانک اسے ایک اور حویلی کا خیال آیا اور اس مکان میں رہنے والوں کی صورتیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ ''اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟'' اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ ''عصمت اور راحت کس حال میں ہوں گی؟ وہ پاکستان سے نزدیک ہیں۔ وہ دریا پار کر کے پاکستان پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن اگر وہ وہیں ہوئے تو؟ اگر سکھوں نے وہاں بھی حملہ کر دیا ہو تو۔۔۔۔۔؟'' سلیم انتہائی مایوسی کی حالت میں زندگی کا سمٹتا ہوا دامن پکڑ رہا تھا۔ وہ تاریک آندھی اور بھیانک طوفان میں ایک نئی مشعل جلا رہا تھا۔ وہ ایک بار ڈوبنے کے بعد اپنی کی سطح پر آ کر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ''عصمت! عصمت!! عصمت!! عصمت!!!'' اس کے دل کی دھڑکنیں پکار رہی تھیں اور عصمت جیسے آگ کے شعلوں کے درمیان کھڑی کہہ رہی تھی۔ ''سلیم مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!''

ایک عیسائی نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ ''شیر سنگھ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سکھوں کے گھروں کے میں آگ لگانے کے بعد وہ ہمارے محلے میں آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے میں اس گاؤں کے تمام مکان جلا دوں گا۔ تم بھی نکل جاؤ، اب اس گاؤں میں کوئی نہیں رہے گا۔''

کاکو اور اس کے ساتھی یہ سنتے ہی اپنے محلے کی طرف بھاگے۔ سلیم نے مڑ کر گاؤں کی دوسری طرف دیکھا۔ سکھوں کے گھروں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

مہندر نے کہا۔ ''وہ اب کسی کا کہا نہیں مانے گا۔ وہ آتے ہی پہلے اس آگ میں

کودنے لگا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے روکا۔ اس کے بعد وہ چیخیں مارتا ہوا بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی ایک بوتل تھی۔ اس نے اپنی پگڑی کو لاٹھی کے ایک سرے پر لپیٹ کر اس پر تیل چھڑکا، پھر اس آگ سے اسے روشن کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں اب سارے گاؤں کو راکھ کا ڈھیر بنا دوں گا۔ گاؤں کے سکھ واپس آ کر صرف افضل کے گھر کی راکھ نہیں دیکھیں گے۔'' وہ کل سے ہمارے گاؤں میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ کل رات ہمارے گاؤں میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ کل رات ہمارے گاؤں کے آدمی جو یہاں سے مار کھا کر گئے تھے، اسے قتل کرنا چاہتے تھے، میں نے اسے اٹھا کر اپنے مکان کی کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔ وہ سارا دن دروازہ توڑتا رہا اور مجھے گالیاں دیتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ باہر نکلتے ہی سیدھا اس طرف آئے گا اور سکھوں کی گولیوں کا نشانہ بنے گا۔ شام کے وقت روپا اسے ہمارے گاؤں میں تلاش کر رہی تھی۔ ہمارے گاؤں کے آدمی جو جتھے کے ساتھ تھے، واپس آئے اور مجھے معلوم ہوا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا، وہ کوٹھری سے نکلتے ہی سیدھا اس طرف بھاگا۔ میں اور روپا اس کے پیچھے تھے!''

سلیم نے کہا۔ ''نہیں مہندر! کھیل ختم نہیں ہوا، کھیل ابھی شروع ہوا ہے قوموں کے کھیل اس طرح ختم نہیں ہوتے۔ وہ دن دور نہیں جب راکھ کے ان ڈھیروں سے بجلیاں نمودار ہوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے سلیم نے آگے بڑھ کر ایک کونے سے بجھی ہوئی راکھ کی ایک مٹھی اٹھالی اور اسے رومال سے باندھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری قوم کی پونجی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس راکھ سے نئے مورچے

اور نئے قلعے تعمیر ہوں گے۔ اس راکھ سے ایک نئی قوم جنم لے گی۔ کھیل ابھی ختم نہیں ہوا مہندر!''

عیسائیوں کے محلے میں آدمی، عورتیں اور بچے دہائی مچا رہے تھے اور شیر سنگھ کی آواز برابر آ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو! ہٹ جاؤ، بدمعاشو! تم نے ایک طرف بیٹھ کر تماشا دیکھا ہے، اب اس گاؤں میں کوئی نہیں رہے گا!'' روپا ہوئی باہر نکل گئی۔

سلیم نے بشیر اور باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ ''تم دیکھو اگر گھوڑے یہیں ہیں تو انہیں پکڑ لو اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر تمہیں جتنا بارود مل سکتا ہے، وہ جمع کر لو۔ مسجد سے میری رائفل بھی اٹھا لاؤ، میں ابھی آتا ہوں!''

ایک آدمی بولا۔ ''میں نے کھیت میں ایک زخمی سکھ سے ٹالی گن اور گولیوں سے بھرا ہوا تھیلا چھینا تھا اور میں اسے جوہڑ کے کنارے اپلوں کے ڈھیر میں چھپا آیا ہوں۔''

دوسرا آدمی جو مجید اور داؤد کے ساتھ برین کیریر پر حملہ کرنے کے لیے گیا تھا، بولا۔ ''دو آدمیوں نے کھیت میں میرا پیچھا کیا تھا۔ ایک زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور دوسرے کو میں نے گرا لیا تھا۔ اس کے پاس اسٹین گن تھی۔''

سلیم نے کہا۔ ''وہ سب لے آؤ!''

بشیر بولا۔ ''کھیت میں ہمیں شاید اور بھی بہت کچھ مل جائے لیکن فالتو ہتھیاروں کو ہم کیا کریں گے۔''

سلیم نے جواب دیا۔ ''ہمیں راستے میں ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والے

بہت مل جائیں گے۔ جاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔ داؤد مجید کو لے کر آجائے تو انہیں کہو کہ تیار ہو جائیں۔" یہ کہہ کر سلیم بھاگتا ہوا عیسائیوں کے محلے میں داخل ہوا۔

عیسائیوں نے شیر سنگھ کو ایک چارپائی پر ڈال کر رسیوں سے جکڑ رکھا تھا۔ سلیم مردوں، عورتوں اور بچوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ شیر سنگھ انہیں بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا اور روپا اس کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔

کاکو عیسائی نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اسے مجبور ہو کر باندھا ہے۔ یہ مگھر کے گھر کو آگ لگا رہا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ سے مشعل چھینی ہے، اس نے ایک آدمی کو مکا مار کر چھت سے نیچے گرا دیا تھا۔

شیر سنگھ چلایا۔ "میں سب کو مار ڈالوں گا۔ اب اس گاؤں میں کوئی نہیں رہے گا۔
"

روپا نے کہا۔ "باپو! دیکھو سلیم آیا ہے، باپو ہوش میں آؤ۔"

وہ چلایا۔ "روپا کی بچی خاموش رہو۔ اگر تم نے پھر یہ بات کہی تو میں تمہارا گلا گھونٹ ڈالوں گا، مجھے معلوم ہے سلیم پاکستان گیا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے فوجیں لے کر آئے گا!"

روپا نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سلیم! ان سے کوئی بات کرو۔ انہیں سمجھاؤ!"

سلیم نے جھک کر شیر سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ " گاؤں کے عیسائیوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔ انہوں نے ہماری مدد کی ہے۔ ان غریبوں کے گھر مت جلاؤ

چچا!''

شیر سنگھ نے گرج کر کہا۔ ''تم کون ہو؟ چلے جاؤ یہاں سے!''

روپا نے سلیم کے ہاتھ سے ٹارچ چھین کر اس کے چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''باپو دیکھو! یہ سلیم ہے۔ اسے پہچانتے نہیں تم؟''

وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے بیوقوف سمجھتی ہو۔ یہ سلیم کہاں ہے۔ میں نے تمہیں ایک بار کہا ہے کہ وہ فوج لے کر آئے گا۔ وہ افضل اور گلاب سنگھ کے خون کا بدلہ لے گا۔''

سلیم نے کاکو سے کہا۔ ''کاکو میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ تم اس کا خیال رکھو۔ شاید اسے شراب میں کوئی زہریلی شے پلا دی گئی ہے۔''

پھر وہ روپا کے ہاتھ سے ٹارچ لیتے ہوئے بولا۔ ''روپا! جب انہیں ہوش آجائے تو کہہ دینا کہ میں کسی دن ضرور آؤں گا!''

چند قدم چل کر وہ رکا۔ روتی ہوئی عورتیں اور مرد اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہاری نیکی کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر تم سے ہو سکے تو ان لاشوں پر مٹی ڈال دینا۔''



رات کے دو بجے سلیم اور اس کے ساتھی گاؤں سے کوچ کرنے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ گولی لگنے سے ایک گھوڑی کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور وہ چلنے کے قابل نہ

تھی۔ ایک گھوڑے کی پچھلی ران پر معمولی زخم تھا۔ باقی دو گھوڑے جن میں سے ایک سلیم کا تھا اور ایک وہ تھا جو فتو پہلوان نے رام چند سے چھینا تھا، ٹھیک ہے۔ مجید گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھنے کے قابل نہ تھا۔ اس لیے سلیم دو آدمیوں کو ساتھ لے کر وہ زینیں اٹھا لایا جو ابھی تک گنوں کے کھیت میں بیری کے نیچے پڑیں تھیں۔ مہندر گاؤں سے اپنا گھوڑا لینے کے لیے گیا تھا۔ لیکن سلیم کے ساتھیوں نے اس کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ داؤد نے کہا۔ ''سلیم! مجید کو ایک گھوڑے پر سوار کرا دو اور باقی دو گھوڑوں پر تم اور بشیر دو آدمیوں کو لے کر سوار ہو جاؤ۔ میں اور مختار تمہارے ساتھ پیدل چلتے ہیں۔ جب ہم تھک جائیں گے تو تم پیدل چلنا۔''

سلیم نے مجید سے کہا۔ ''مجید! اگر تمہیں زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہوں!''

مجید کسی اور دنیا میں تھا۔ اب تک اس نے کسی کے ساتھ بات نہ کی تھی۔ اس کی نگاہیں آگ کے ان شعلوں پر مرکوز تھیں، جو اس کی متاع حیات کو بھسم کر چکے تھے۔ سلیم کے سوال پر وہ چونکا۔ ''نہیں! ابھی میں تمہاری مدد کے بغیر گھوڑے پر بیٹھ سکتا ہوں!''

وہ سوار ہو رہے تھے کہ مہندر بھی گھوڑا بھگاتا ہوا پہنچ گیا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور اس کی باگ سلیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ ''اب جلدی کرو!''

سلیم نے کہا۔ ''مجید! تم اور مختار اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ!''

گاؤں کے عیسائی پھر ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ جب وہ رخصت ہو رہے تھے

تکلیف دہ ہوتی۔"

سلیم نے کہا۔"اس علاقے کے سکھوں میں تین انسان تھے۔ایک گلاب سنگھ جسے انہوں نے مار ڈالا۔ایک شیر سنگھ جو شاید پاگل ہو چکا ہے اور ایک تم ہو مہندر!"

مہندر نے کہا۔"اگر میں بھی گلاب سنگھ کی طرف مارا نہ گیا تو شیر سنگھ کی طرح پاگل ہو جاؤں گا!"

مجید کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔اس نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔"تم لوگ وقت ضائع کر رہے ہو۔اب تین بجنے والے ہیں۔"لیکن اچانک اسے چند قدم دور پگڈنڈی پر کوئی دکھائی اور اس نے گھوڑا روک کر اپنی سٹین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔"ٹھہرو! کون ہے؟"

مہندر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔"یہ بسنت ہے مجید، میری بہن۔وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔"

لڑکی کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔"میں مہندر کی بہن ہوں۔"

مجید نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔"مہندر ہمیں معلوم ہے تمہاری بہن تم سے مختلف نہیں لیکن اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی!"

مہندر نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔"ایک منٹ ٹھہرو مجید! کل صبح حملے سے پہلے بسنت نے بلونت کی ایک ٹامی گن نکال کر چھپا لی تھی۔اس کے ساتھ بارود کا تھیلا بھی ہے۔بلونت نے ہم سب کو پیٹا لیکن اس نے اسے ان چیزوں کا پتہ نہیں بتایا۔مجھے بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ٹامی گن اس نے چھپا رکھی ہے۔

جب میں گھوڑا لینے گیا تو اس نے مجھے بتایا۔"

اتنی دیر میں لڑکی قریب آ چکی تھی۔سلیم نے گھوڑا آگے بڑھا کر اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ بسنت کا چہرہ زخموں سے سوجا ہوا تھا۔سلیم کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی!"

مجید نے کہا۔"سلیم روشنی مت کرو!"

سلیم نے ٹارچ بجھا دی۔ بسنت نے ٹامی گن اور گولیوں کا تھیلا اس کے سامنے پیش کر دیا۔

مہندر نے مجید کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔"مجید یہ چیزیں میں خود لے کر آتا لیکن بسنت کو مجھ پر اعتبار نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد سلیم اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ مہندر اور بسنت ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سن رہے تھے۔ بسنت کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ بالآخر سسکیاں لیتے ہوئے مہندر کے ساتھ لپٹ گئی۔"بھیا! بھیا!!" اس نے کہا۔"تمہیں یقین ہے کہ وہ زندہ پاکستان پہنچ جائیں گے؟"

"مجھے یقین ہے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ کسی دن واپس آئیں گے۔ پاپ کی آگ انصاف کی آگ کو جنم دے گی اور وہ اس وقت تک نہیں بجھے گی جب تک کہ ظلم ختم نہیں ہو جاتا!"

مغرب کی صرف بجلی چمک رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اب تیز ہو رہے

تھے۔آگ کے شعلے آہستہ آہستہ تمام گاؤں میں پھیل چکے تھے،عیسائیوں کے محلے سے بھی اب چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی...... اور بسنت اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''مہندر!یہ آگ نہیں بجھے گی...... یہ آگ جس نے زبیدہ،صغریٰ، عائشہ،طاہرہ اور انوری کو جلایا ہے،کبھی نہیں بجھ سکتی ۔''



راستے میں ان کے ساتھ پاکستان کارخ کرنے والے پناہ گزینوں کی ٹولیاں شامل ہوتی گئیں۔ایک قافلے میں چند ایسے آدمی،عورتیں اور بچے بھی تھے۔جنہوں نے سلیم کے گھر میں پناہ لی تھی اور سکھوں کی آخری یلغار کے وقت ادھر ادھر بھاگ کر اپنی جانیں بچالی تھیں لیکن سلیم کے خاندان کا کوئی آدمی ان کے ساتھ نہ تھا۔صرف اس کے گاؤں کا ایک سقہ اور اس کی بہن تھی۔یہ دونوں زخمی تھے اور بڑی مشکل سے قافلے کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔سلیم نے اپنا گھوڑا ان کے حوالے کر دیا۔اس کی دیکھا دیکھی اس کے باقی ساتھیوں نے اپنے گھوڑوں پر زخمیوں کو لا د دیا اور خود پیدل چل پڑے۔مجید نے ایک زخمی بچے کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

ایک ٹولی میں سلیم کو چند نہتے سپاہی مل گئے جو باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی ملازمت سے سبکدوش کر دیے گئے تھے سلیم نے چار فالو ر ائفلیں ان میں تقسیم کر دیں۔

مجید گھوڑے کی زین پر نڈھال سا ہو کر کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھک رہا تھا۔ سلیم نے ایک آدمی سے کہا۔ ''تم اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لو، یہ بہت تکلیف میں ہے۔ مجید لاؤ یہ ٹامی گن مجھے دے دو!''

مجید نے چونک کر سلیم کی طرف دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں، مجھے صرف پیاس لگ رہی ہے۔''

سلیم نے کہا۔ ''بس اب نہر بالکل نزدیک ہے!''

مجید دوسرے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم لوگ ہوشیار رہو ، شاید پل پر کوئی خطرہ ہو !''

راستے میں نہر کے قریب مسلمانوں کا ایک گاؤں جل رہا تھا اور سڑک اور آس پاس کے کھیتوں میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔'' آگے مت جاؤ وہ نہر کے پل پر کھڑے ہیں۔''

سلیم نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ ''ان کے ساتھ فوج کے آدمی بھی ہیں؟''

''ہاں! وہ لوگوں کو روک کر تلاشی لیتے ہیں اور پھر نہر کے دوسرے کنارے چھپا ہوا جتھا حملہ کر دیتا ہے!''

قافلے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بعض لوگ تین چار میل نیچے جا کر اگلا پل عبور کرنا چاہتے تھے لیکن سلیم نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ ''تم پاگل ہو، وہ نہر کے ہر پل پر موجود ہوں گے۔ تم اس طرح بچ کر نہیں نکل سکتے۔ تم اگر بھیڑوں کی طرح بھاگو گے تو سب مارے جاؤ گے۔ ہم اس پل پر سے گزریں گے اور تم دیکھو گے کہ وہ ہمارا

بال بیکا نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہمیں تمہارا خیال نہ ہوتا تو اب تک ہم راوی کے پار پہنچ چکے ہوتے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتے لیکن یاد رکھو جو پیچھے رہ جائے گا ہم اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھیں گے، ہم خودکشی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو نہیں بچا سکتے!"

سلیم نے چند اور باتیں کیں اور بد حواس لوگوں کے دلوں میں ایک نیا ولولہ زندہ کر دیا۔

مجید کو اب پیاس اور درد کا احساس نہ تھا، اپنے گھوڑے سے زخمی بچے کو اتار کر اس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قافلے کے آدمیوں کو ہدایات دیں اور بالآخر اپنے مسلح ساتھیوں کو چند باتیں سمجھانے کے بعد قافلے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پل سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر اس نے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ زخمیوں کے گھوڑوں کو لے کر ایک طرف ہو جائیں اور راستہ صاف ہونے کا انتظار کریں۔

جب وہ پل کے قریب پہنچے تو ڈوگرہ فوج کے آٹھ مسلح سپاہیوں سے ان کا راستہ روک لیا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ٹھہرو! ہم تمہاری تلاشی لے گا۔ ہمارا ڈیوٹی ہے کہ تلاشی لینے کے بعد تم کو پاکستان پہنچا دیا جائے۔ ڈرو نہیں ہم سکھ نہیں ہے۔ تم دیکھ سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹارچ کی روشنی اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور پھر کہا۔ "اب تمہارا تسلی ہو گیا۔ اچھا ہم لوگ عورت کی تلاشی نہیں لے گا۔ عورت سب کی ماں بہن ہے، ہم ان کی عزت کرتا ہے۔ وہ اس طرح ہو جائے۔ ہم صرف آدمی لوگ کی تلاشی لے گا۔ جلدی کرو، ڈرنے کی کوشش بات نہیں۔ سرکار نے ہم کو

تمہاری حفاظت کے لیے بھیجا ہے!''

مجید چند قدم دور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا تھا۔سلیم تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور دبی زبان میں بولا۔''مجید ہم انہیں ایک منٹ میں ختم کر سکتے ہیں۔''

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔''ابھی نہیں،لوگوں سے کہو کہ وہ عورتوں کو ایک طرف نکال دیں۔ٹھہرو!اپنی بندوق اور تھیلا یہیں رکھ دو اور پھر آگے بڑھ کر اطمینان سے بات کرو۔''

سلیم نے رائفل اور تھیلا درخت کی آڑ میں رکھ دیا اور آدمیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔''دیکھو بھائیوں ڈرو نہیں، کپتان صاحب کا حکم مانو!''

ڈوگرہ سپاہی نے کہا۔''ہم کپتان نہیں ہے، ہم جمعدار ہے۔تم اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔یہ لوگ بہت ڈر گیا ہے،ان کو سمجھاؤ!''

سلیم نے قافلے کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔''دیکھو تم غلطی کر رہے ہو۔ تم نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میرا کہا مانو گے۔اگر تم بھول گئے ہو تو میں پھر یہ کہتا ہوں کہ تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔عورتیں اطمینان سے دائیں طرف آ کر بیٹھ جائیں۔''

باقی مسلح آدمی بھی قافلے میں گھس کر لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔مردوں نے بادل نخواستہ لرزتے رکانپتے اور سہمے ہوئے بچوں اور عورتوں کو ایک طرف دھکیل دیا۔

تھوڑی دیر میں آدمی اور عورتیں دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر پڑی پر بیٹھ گئے اور پل

کے سامنے خالی سڑک ان کے درمیان حد فاصل بن گئی۔ڈوگرہ سپاہی اطمینان سے کھڑے تھے۔

ڈوگر جمعدار نے اپنا لہجہ قدرے تبدیل کرتے ہوئے کہا۔''دیکھو تمہارے پاس اگر کوئی ہتھیار ہے تو خود ہی نکال کر ہمارے حوالے کردو۔ورنہ تلاش کے بعد اگر کسی سے کوئی چیز نکلا تو ہم گولی مار دے گا!''

جمعدار کے اشارے پر باقی ڈوگرے پٹری سے نیچے درختوں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ان کا منہ پل کی طرف اور پیٹھ درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے آدمیوں کی طرف تھی۔ڈوگرہ جمعدار نے جو پوزیشن سنبھالی تھی، اس کے مطابق بہت کم آدمیوں کے ان کی گولیوں سے بچ کر سڑک یا یا کھیتوں کی طرف بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔اس نے پل کے پار دوسرے کنارے چھپے ہوئے جتھے کو ٹارچ کے ساتھ سگنل دیا۔پھر قافلے کے آدمیوں سے کہا۔''معلوم ہوتا کہ تمہارے پاس کچھ نہیں۔اب پہلے آدمی لوگ پل پر سے گزر جائیں، پھر ہم عورت کو گزارر ہے گا!''

لیکن قافلے کے آدمیوں میں سے کسی کو جنبش تک نہ ہوئی۔ڈوگرہ نیق درے حیران ہو کر کہا۔''تم نے ہمارا حکم نہیں سنا۔ہم تم کو پل کے پار پہنچنے کے لیے دو منٹ دیتا ہے......وہ تمہارا آدمی کدھر ہے جو ہم کو کپتان بولتا تھا؟''

جمعدار کے اشرے پر اس کے ساتھیوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لیے اپنی رائفلیں سیدھی کر دیں۔اچانک درختوں کی آڑ سے مجید کی آواز آئی۔''لیٹ جاؤ!'' اور ساتھ ہی اسٹین گنوں اور ٹامی گن کی تڑتڑ سنائی دینے لگی۔ڈوگرے آن کی آن میں

زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

اکال سینا کا جتھا جو دوسرے کنارے پٹری کے نیچے گھات لگائے اپنے شکار کا انتظار کر رہا تھا، غالباً یہ سمجھا کہ یہ فائر ان کے فوجی رہنماؤں نے کیے ہیں، وہ ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ جب انہوں نے پل کا نصف حصہ عبور کر لیا تو داؤد، سلیم اور باقی آدمی گولیاں برساتے ہوئے آگے بڑھے۔ سکھ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور گراتے ہوئے واپس مڑے، بعض نے نہ میں چھلانگیں لگا دیں۔ تھوڑی دیر میں پل لاشوں سے پٹ گیا۔ مجید گھوڑا بھگا کر لاشوں کو روندتا اور ٹامی گن سے فائر کرتا ہوا آگے بڑھا اور باقی آدمی بھی گولیاں برساتے ہوئے پل سے کچھ دور آگے نکل گئے۔



نہر کے نیچے سڑک پر سکھوں کے پانچ چھکڑے کھڑے تھے۔ ان پر لوٹ مار کے سامان کے علاوہ رسیوں میں جکڑی ہوئی چند عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ چھکڑوں کے آس پاس درختوں کے ساتھ دس بارہ گھوڑے بندھے ہوئے۔ ان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ زخمیوں اور بچوں کو سوار کر دیا گیا جو کئی کوس سفر کرنے کے بعد تھکاوٹ سے چور ہو چکی تھیں۔ قافلے کے آٹھ اور آدمی ڈوگرہ سپاہیوں سے چھینی ہوئی رائفلوں کے ساتھ مسلح ہو چکے تھے۔ سلیم ٹارچ جلا کر ایک چھکڑے پر بندھی ہوئی عورتوں کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹ رہا تھا۔

ایک نوجوان نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ’’آپ ...... آپ بہت دیر سے آئے۔ کاش آپ اس وقت آئے جب ہمارے گاؤں پر حملہ ہوا تھا!‘‘

گاؤں کا لفظ سن کر سلیم کی آنکھوں کے سامنے آگ کے شعلے رقص کرنے لگے۔

اس نے لڑکی کے پاؤں کی رسیاں کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’تمہارا گاؤں کہاں ہے؟‘‘

’’میرا گاؤں! آپ نے پل کے پار سڑک کے کنارے آگ کے شعلے نہیں دیکھے؟ وہ میرا گاؤں تھا۔‘‘

’’تمہارے ساتھ کوئی اور؟‘‘ سلیم کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔

’’میرا باپ تھا، میرے چار بھائی تھے، میرے دو چچا تھے۔ اب کوئی بھی نہیں۔ میری تین بہنیں آگ میں جل گئیں۔ میں اور ماں کنوئیں کی طرف بھاگی تھیں لیکن انہوں نے پکڑ لیا۔ اب آگ آ گئے لیکن اب کیا فائدہ......!‘‘ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔ ’’عابدہ! عابدہ! بیٹی صبر کرو!‘‘

چھکڑے قافلے کے آگے آگے چل پڑے اور مسلح آدمی سڑک کے دائیں اور بائیں کنارے قافلے کی حفاظت کر رہے تھے۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اور مجید بار بار قافلے کو تیزی سے قدم اٹھانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ گھوڑے کو بھگاتا ہوا کبھی قافلے کے آگے اور کبھی پیچھے ہو لیتا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کو یہ سلم ہو چکا تھا کہ ان کا راہنما کون ہے۔

وہ پوچھتے۔ ''صوبیدار! اب دریا کتنی دور ہے؟ ہم کب پہنچیں گے؟ آگے کوئی خطرہ تو نہیں؟'' اور وہ گھوڑا روک کر کسی کو نرمی سے جواب دیتا اور کسی کو جھڑکتا ہوا آگے گزر جاتا۔

چھ بجے کے قریب اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اچانک اس نے ہتھے پر سٹر ٹیک دیا اور اس کے ہاتھ سے ٹامی گن گر پڑی۔ گھوڑا رک گیا۔ لوگوں کے شور مچانے پر سلیم اور داؤد بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ اسے گھوڑے سے اتار اور عورتوں کے درمیان ایک چھکڑے پر لٹا دیا۔ سلیم نے دیکھا اس کا جسم بخار سے جل رہا تھا۔

جب مجید کو ہوش آیا تو عابدہ اس کے زخموں پر پٹیاں باندھ رہی تھی اور اس کی جگہ سلیم گھوڑے کو ادھر ادھر بھگاتا ہوا قافلے کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق کی بجائے ٹامی گن تھی۔

سلیم نے چھکڑے کے قریب پہنچ کر مجید کی طرف دیکھا۔ عابدہ نے کہا۔ ''اب یہ ہوش میں ہیں۔''

لڑکی کی ماں بولی۔ ''بیٹا! یہ تمہارا بھائی ہے نا؟

''جی ہاں!''

ایک عورت بولی۔ ''یہ سب کا بھائی ہے!''

مجید نے سر اٹھا کر سلیم کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''ایک شاعر کو سپاہی بنانے کے لیے کتنے بڑے انقلاب کی

ضرورت تھی۔"

راستے میں قافلے کے آدمیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ صبح آٹھ بجے تک ان کی تعداد تین ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ سڑک پر جگہ جگہ مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈیرہ بابا نانک تک سکھوں کے چار اور جتھوں نے یکے بعد دیگرے ان پر حملہ کیا لیکن نہتوں کی بجائے مسلح آدمیوں کا سامنا کرنا ان کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ وہ قافلے کے آدمیوں کو نہتے سمجھ کر آندھی کی طرح آتے۔ فضل "ست سری اکال، پنتھ کی جے" اور "خالصتان کی جے" کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ جب وہ قریب آجاتے تو اچانک گولیوں کی تڑاخ سنائی دیتی اور اس کے ساتھ "اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد" کے نعرے بلند ہوتے اور حملہ آور چیختے چلاتے بھاگ نکلتے۔ "ان کے ساتھ فوج ہے، ان کے ساتھ مسلمانوں کی فوج ہے، ان کے ساتھ بلوچ رجمنٹ ہے۔ بھاگو! بھاگو!!"

راستے میں سب سے زیادہ خطرناک مقام ڈیرہ بابا نانک تھا۔ وہاں گوردوارہ اور پولیس اسٹیشن اکال سینا کے مرکز تھے۔ ہندو سب انسپکٹر بلوائیوں کا راہنما تھا لیکن اسے قافلے کی آمد سے پہلے یہ اطلاع مل چکی تھی۔ کہ نہتے لوگوں کی حفاظت کے لیے فوج بھی آئی ہے۔ چنانچہ قافلے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر شہر سے گزر گیا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہے تھے، تھانیدار سکھوں کی ایک ٹولی کے ساتھ بند دروازے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قافلے گزر گیا تو تھانیدار نے غضبناک ہو کر ایک سکھ کی داڑھی پکڑ لی۔ "بدمعاش!

ان کے ساتھ فوج کہاں ہے؟''

اس نے کہا۔''جی میں جھوٹ نہیں کہتا، بچن سنگھ سے پوچھو، یہ ہمارے گھوڑوں پر سوار ہیں، ہمارے چھکڑے لے جا رہے ہیں، یہ وہی ہیں جنہوں نے نہر پر ہمارے ساتھ ستر آدمی مار دیے تھے۔ڈوگروں کو انہوں نے ایک منٹ میں صاف کر دیا تھا۔ فوج شاید ان کے پیچھے ہو۔''

دوسرے سکھ نے کہا۔''ہم نے ان پر کرن کے پل کے قریب حملہ کیا تھا۔ان کے ساتھ جو سپاہی ہیں، وہ وردیوں کے بغیر ہیں۔اگر آپ انکی تلاشی لے سکتے تو آپ کو نصف سے زیادہ آدمی مسلح ملتے!''

تیسرے نے کہا۔''میں آپ کے لیے بہت بڑا تحفہ لایا تھا۔میرے چھکڑے پر عظیم خان کی لڑکی تھی۔اب وہ اس کے ساتھ میرا چھکڑا اور آٹھ سو روپے کے بیل بھی لے جا رہے ہیں۔''

تھانیدار نے کہا۔''اب تم دریا کے پل پر جا کر تلاش کرو......اگر بیل تمہیں زندہ نہ ملے تو کم از کم ان کی کھالیں اتار سکو گے۔''

''لیکن سردار جی!وہ لڑکیاں، خاص کر عظیم خان کی لڑکی تو بڑی خوبصورت ہے۔

''

ڈیرہ بابا نانک سے آگے پکی سڑک دریا کے پل تک لاشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ قافلہ سڑک پر پہنچا ہی تھا۔کہ سڑک کے کنارے ایک چری کے کھیت میں چھپے ہوئے دو مسلمان سپاہی نمودار ہوئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر قافلے کو ہاتھ کے اشارے

سے روک لیا۔ سلیم گھوڑا بھگاتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو ایک سپاہی نے کہا۔ ''پل پر ڈوگرہ رجمنٹ کا قبضہ ہے۔ آپ لوگ آگے مت جائیں۔''

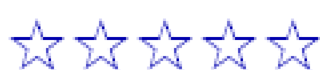
سلیم نے پیچھے مڑ کر داؤد کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''ہم ضرور جائیں گے، اگر آگے خطرہ ہے تو ہمارے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں!''

''لیکن تم ان عورتوں اور بچوں کو مشین گنوں کے ساتھ کھڑا نہیں کر سکتے ان کے پاس آرمرڈ کاریں ہیں۔ ادھر دیکھو!'' یہ کہتے ہوئے سپاہی نے سڑک پر بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں وہ کوئی پانچ ہزار آدمیوں کو شہید کر چکے ہیں!''

سلیم نے کہا۔ ''لیکن آپ نے باؤنڈری فورس کے ہیڈ کوارٹر میں اطلاع نہیں دی؟''

''ہم اطلاع دے چکے ہیں لیکن وہاں زیادہ تعداد ہندو اور سکھ افسروں کی ہے۔ وہ ہمیں ایک طرف بھیج دیتے ہیں اور دوسری طرف حملہ کروا دیتے ہیں۔ جو تھوڑے بہت مسلمان افسر ہیں، وہ اس طرح بکھیر دیے گئے کہ وہ کچھ کر ہی نہ سکیں۔ کل شام تک ہماری رجمنٹ کے سپاہی بٹالہ سے ایک بہت بڑا قافلہ لے کر آئیں گے، پھر آپ دیکھیں گے کہ ان ڈوگروں کو کسی اور جگہ حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔ جب تک ہماری رجمنٹ پل کی حفاظت کرے گی۔ ان کی کوشش یہ ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ قافلے ان سڑکوں پر سے گزریں جہاں مسلمان سپاہی نہیں۔ اب آپ کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ دریا کے نیچے چند میل کے فاصلے پر ہزاروں مسلمان جمع ہیں۔

وہاں آپ کو کشتیاں مل جائیں گی۔



ڈیرہ بابا نانک کے پل سے آٹھ میل نیچے کی طرف دریا کے کنارے قرب و جوار کے دیہات کے کوئی بیس ہزار لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اور ہر آن نئے قافلوں کی آمد سے ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

دوپہر کے وقت یہ قافلہ بھی وہاں پہنچ گیا اور اس کے ساتھ چند مسلح آدمیوں کو دیکھ کر لوگوں کے مایوس چہروں پر امید کی روشنی جھلکنے لگی۔ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک ایک دوسرے سے لٹی ہوئے عصمتوں، خاک اور خون میں کھیلتی ہوئی جوانیوں اور جلے ہوئے گھروں کی داستانیں ہی سنی تھیں۔ اب اس قافلے کے مردوں اور عورتوں کی زبانی یہ سن رہے تھے۔ کہ فلاں جگہ ان بہادروں نے فوج کا یوں مقابلہ کیا اور فلاں فلاں مقام پر جتھوں کو اس طرح بھگایا۔ سلیم اور مجید کے خاندان کی داستان قافلے کا ہر بچہ، ہر عورت اور ہر مرد اپنی اپنی معلومات کے مطابق نئے انداز میں بیان کر رہا تھا۔

قرب و جوار کی بستیوں کے لوگ اپنے مال، مویشی اور ایک خاصی مقدار میں خورد و نوش کا سامان چھکڑوں پر لاد کر لے آئے تھے۔ اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان لوگوں میں راشن تقسیم کر رہے تھے۔ جو دور دور سے بے سر و سامانی کی حالت میں آئے تھے۔

آدمی ہو سکتے ہیں۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''انہیں اسلام کا کیا پتہ؟ ہمارے لیے تو وہ سکھوں سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔''

سلیم نے کہا۔ ''بابا یہ ہمارا قصور ہے۔ ہم نے انہیں قومی اور اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں سے روشناس ہی نہیں کیا۔ میں جاتا ہوں۔''

ایک نوجوان نے کہا۔ ''اصل میں یہ سارا قصور ملاحوں کا نہیں، پار کے گاؤں کا ایک چودھری ان سے حصہ وصول کرتا ہے۔ ملاح اس کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ہم نے اسے سمجھایا ہے لیکن وہ بہت بڑا آدمی ہے اور بدمعاشوں کی ایک ٹولی اس کے ساتھ ہے۔ اگر آپ اسے سمجھا سکیں تو ملاح بھی ٹھیک ہو جائیں گے!''

سلیم نے کہا۔ ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میں پار سے آیا ہوں۔ میں بھی ایک ملاح ہوں۔ میں نے کسی معاوضے کے بغیر لوگوں کو نکالنا شروع کیا تھا، میں نے تین پھیرے لگائے لیکن جب چوتھی بار کشتی لے کر آیا تو ایک دم ڈیڑھ دو سو آدمی میری کشتی پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ان کی منتیں کیں، ہاتھ جوڑے لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتی ڈوب گئی...... مجھے کشتی کا افسوس نہیں لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ اب میں اپنے بھائیوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا!''

''تم بہت کچھ کر سکیت ہو، میرے ساتھ آؤ!''

اڑھائی بجے کے قریب سلیم، داؤد اور یہ نوجوان ملاح جس کا نام فقیر دین تھا، تیر

کر دریا کے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ ملاحوں نے پہلے کورا جواب دیا پھر ذرا روکھے پن سے سلیم کے ساتھ باتیں کرنے لگے لیکن کوئی پندرہ منٹ کی تقریر کے بعد سلیم ان میں سے چند آدمیوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔ اس کی تقریر، سننے والوں کے دلوں پر تیر و نشتر کا کام کر رہی تھی۔ ایک نوجوان نے جذبات سے بے قابو ہو کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہے ایسی کمائی پر۔'' پھر وہ آگے بڑھ کر کشتی کا رسہ کھولتے ہوئے سلیم کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ ''قوم کی عزت برباد ہو رہی ہے اور ہم دوزخ کی آگ سے جھولیاں بھر کر خوش ہو رہے ہیں۔''

ایک بوڑھے ملاح نے اپنا حقہ اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اور کہا۔ ''بابو جی! مسلمان کا پیسہ ہمارے لیے سور کا گوشت ہوگا۔ صادق اٹھو، ورنہ میں تمہارا حقہ بھی توڑ دوں گا!''

تھوڑی دیر میں پانچ کشتیاں دوسرے کنارے کا رخ کر رہی تھیں۔

ایک ہٹا کٹا سیاہ فام ملاح قدرے پریشان ہو کر کبھی اپنے ساتھیوں اور کبھی سلیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا سفید پوش پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان کو دن کے وقت دریا میں کشتیاں ڈالنے کے لیے کس نے کہا ہے؟''

سیاہ فام ملاح نے اٹھ کر جواب دیا۔ ''چوہدری جی! یہ بابو تو ہم پر تھانیدار سے بھی زیادہ رعب ڈال رہا ہے۔''

چوہدری سلیم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''یہ کسی کے نوکر نہیں کہ سارا دن کشتیاں

چلاتے رہیں۔ اگر ادھر سے سکھ حملہ کر دیں تو ان کی جان کا ذمہ دار کون ہے؟'' پھر وہ کنارے کی طرف بڑھ کر چلایا۔ ''او حرام زادو! کشتیاں واپس لے آؤ۔''

''حرام زادے وہ نہیں تم ہو!'' سلیم نے آگے بڑھ کر ٹامی گن اس کی توند کے ساتھ لگا دی۔ چوہدری کے پانچ ساتھی جو چند قدم پیچھے آ رہے تھے۔ بھاگ کر آگے بڑھے لیکن داؤد نے پستول دکھا کر انہیں روک لیا۔ چوہدری اب بری طرح کانپ رہا تھا۔

سلیم نے کہا۔ ''تم جیسے قوم کے دشمن کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں لیکن کاش میرے پاس فالتو بارود ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ تم صرف ڈنڈے کی زبان سمجھ سکتے ہو لیکن پھر بھی میں تمہیں ایک بار موقع دیتا ہوں۔ اگر میں نے دوسرے بار تمہیں یہاں دیکھا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا...... یہ بدمعاشوں کی ٹولی تمہاری مدد نہیں کر سکے گی اور یہ بھی یاد رکھو، تمہیں لوگوں سے وصول کی ہوئی ایک ایک کوڑی کا حساب دینا پڑے گا۔ اب یہاں سے بھاگ جاؤ!''

چوہدری اور اس کے ساتھیوں نے دوبارہ مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ داؤد نے ہا میں ایک فائر کر دیا اور ان کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔

سیاہ فام ملاح چپکے سے اٹھ کر کنمرے کی طرف بڑھا اور اپنی کشتی کے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔ ''آؤ بابو جی!''

کشتیاں ابھی کچھ دور ہی تھیں کہ بہت سے لوگ اپنے بچوں اور سامان کی گٹھریاں کو اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ بعض لوگ دریا میں اتر کر گھٹنے اور بعض کمر کے

برابر گہرے پانی میں جا کھڑے ہوئے۔ ملاحوں نے یہ دیکھ کر کشتیاں روک لیں۔ سلیم اور داؤد کشتی سے اترے اور لوگوں کو دھکیل دھکیل کر واپس کنارے کی طرف ہٹانے لگے۔ ان کے باقی ساتھیوں میں سے پولیس کے آدمی اس موقع پر بہت کار آمد ثابت ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو ادھر ادھر دھکیل کر دریا کے کنارے کچھ جگہ خالی کرادی۔

سلیم نے کنارے پہنچ کر انہیں سمجھایا۔ ''دیکھو! جب تک تم لوگ مجھے یہ یقین نہیں دلاؤ گے کہ تم صبر سے کام لوگے، یہ کشتیاں آگے نہیں آئیں گی۔ تمہاری بد حواسی کے باعث ایک کشتی دریا میں ڈوب چکی ہے۔ اگر تم اس طرح کرتے رہے تو ایک آدمی بھی دوسرے کنارے نہیں پہنچے گا۔ تم یہ جانتے ہو کہ سب آدمی ایک ہی بار کشتی پر سوار نہیں ہو سکتے۔ ہم سب سے پہلے عورتوں، بچوں اور زخمیوں کو دوسرے کنارے پہنچانا چاہتے ہیں، اس کے بعد دوسروں کی باری آئے گی۔ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ کشتیاں اب چلتی رہیں گی لیکن ایسے بے قاعدگی میں ملاحوں کا کام مشکل ہو جائے گا، میں تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ جب تک یہ کام ختم نہیں ہو گا میں یہیں رہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ میرے ساتھی بھی تمہیں چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہیں کریں گے۔ جب تک ہم زندہ ہیں، سکھوں کو اس طرف نہیں آنے دیں گے۔''



پانچ بجے کے قریب مجید آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ سلیم اس کے قریب پہنچ کر

خاموش کھڑا رہا۔ عابدہ نے کہا۔ ''آپ انہیں جلدی پار پہنچا دیجیے۔ انہیں بہت تکلیف ہے۔''

سلیم نے کوئی جواب دیے بغیر جھک کر مجید کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجید نے آنکھیں کھولیں۔ سلیم نے کہا۔ ''کشتیاں عورتوں اور بچوں کو ایک پھیرا لے کر گئی ہیں تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گی۔''

مجید نے کہا۔ ''سلیم تم جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا تم میری فکر نہ کرو!''

سلیم نے مضطرب ہو کر کہا۔ ''مجید تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں!''

مجید نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بھائی خفا ہونے کی کوئی بات نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ تم پاکستان بھاگ جاؤ!...... میرا مطلب یہ تھا کہ تم ڈاکٹر شوکت کے گھر کا حال معلوم کرو۔ میرا خیال تھا کہ ہم ان لوگوں کو یہاں پہنچاتے ہی ان کے گاؤں کو رخ کریں گے لیکن کاش مجھ میں تھوڑی سی طاقت اور ہوتی، اب تم جاؤ، میں جانتا ہوں تمہارا دل اور دماغ وہاں ہے۔ تم چند گھنٹوں تک انہیں لے کر یہاں پہنچ سکتے ہو۔''

سلیم نے کہا۔ ''مجید! تم داؤد اور بشیر کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ داؤد تمہیں دریا کے پار کسی ڈاکٹر کے سپرد کر کے واپس آ جائے گا تم سفر کے قابل ہو جاؤ تو بہن امینہ کے پاس پہنچ جاؤ۔ میں تمہارے لیے گھوڑے بھی پار پہنچا دیتا ہوں!''

اس کے بعد سلیم نے عابدہ اور اس کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی تیار ہو جائیں۔''

عابدہ کی ماں نے کہا۔ ''بیٹا نارووال میں ہمارے رشتہ دار ہیں، ہم تمہارے بھائی کو وہاں لے جائیں گی اور جب تک یہ تندرست نہیں ہوگا، ہمارے پاس رہے گا۔ اگر نارووال میں اچھا ڈاکٹر نہ ملا تو میرا بھائی سیالکوٹ میں ہے، میں اس وہاں لے جاؤں گی۔ تم یہی سمجھو کہ میں اس کی ماں ہوں!''

سلیم نے مجید کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ''اب وقت ضائع نہ کرو سلیم! اس آگ سے جو کوئی بچ سکتا ہے، اسے بچالو!...... میں جانتا ہوں تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں لیکن ہمارے ساتھ صرف بشیر کافی ہے، داؤد کی یہاں ضرورت ہے یہاں ہر آدمی کی جان میری جان سے زیادہ قیمتی ہے۔''

ایک گھنٹے کے بعد سلیم اور داؤد دریا کے پار مجید، بشیر، عابدہ اور اس کی ماں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

مجید گھوڑے پر سوار تھا اور بشیر اس کی باگ پکڑے ہوئے تھا۔ رخصت کے وقت مجید نے اپنی بش بشرٹ کی جیب سے پستول نکال کر سلیم کو دے دیا اور کہا۔ ''یہ بھی اپنے پاس رکھو اور دیکھو، اگر بارود ختم ہو جائے تو ہتھیار پھینک نہ دینا۔ پاکستان کو ان کی ضرورت ہے۔''

سلیم نے کیمپ کے ہزاروں آدمیوں کو کسی حفاظت کے بغیر چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا۔ اس نے داؤد کے علاوہ فقط ان تین آدمیوں پر اپنا ارادہ ظاہر کیا جو گاؤں سے اس کے ساتھ آئے تھے اور وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ باقی مسلح

آدمیوں کو اس نے کیمپ سے ایک طرف جمع کر کے سمجھایا کہ ہم چند گھنٹوں کے لیے کہیں جا رہے ہیں۔ میری غیر حاضری میں ان لوگوں کو حفاظت تمہارے ذمہ ہے۔ اگر میں نہ آسکوں تو تم آخری دم تک ان لوگوں کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے۔ اگر میں نہ آسکوں تو تم آخری دم تک ان لوگوں کی حفاظت کرنا اور انہیں چھوڑ کر بھاگ نہ جانا۔ میں تم سے اس بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ کیمپ سے ایسے لوگوں کی تلاش کرو جو کشتیاں چلانا جانتے ہیں۔ جب ملاح تھک جائیں تو وہ ان کی جگہ لے لیں۔

ہمارے پاس بارود بہت تھوڑی ہے، اسے بہت احتیاط سے استعمال کرنا!''

پولیس کے ایک کانسٹیبل نے کہا۔ ''ہم بے غیرت نہیں بنیں گے، جب ہمارے ہاتھ خالی تھے تو بھی ہم نے ان عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہ کیا، اب ہمارے پاس رائفلیں ہیں۔ جب تک ہمارے ہاتھ کٹ نہیں جاتے، ہم لڑیں گے لیکن آپ کا یہاں رہنا ضروری تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی جگہ کوئی اور چلا جائے؟''

''نہیں!''

''تو پھر چند آدمی اور ساتھ لیتے جائیں۔''

''نہیں آدمیوں کی یہاں ضرورت ہے!''

ایک اور آدمی نے سوال کیا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''یہاں سے دس بارہ میل ایک گاؤں ہے...... اور وہاں...... وہاں''، سلیم کی آواز بیٹھ گئی اور وہ افق کی طرف دیکھنے لگا۔ حدِ نگاہ پر چند بستیوں سے آگ کے شعلے

اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ سلیم اچانک ایک طرف بھاگا اور ایک چھکڑے کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کا رسا کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔

''سلیم ٹھہرو! ٹھہرو!'' داؤد نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم تنہا نہیں جا سکتے۔''

''جلدی آؤ داؤد!''

ایک منٹ کے اندر داؤد اور ان کے باقی تین ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ان کے راستے میں اجڑی ہوئی بستیاں تھیں، جلتے ہوئے گھر تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں تھیں۔ جنہیں کہیں کہیں گدھ نوچ رہے تھے۔ بعض جگہوں پر گدھوں کی ٹولیاں لاشوں کے پاس بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھیں۔ بھارت کے بھیڑیے ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ شکار مار چکے تھے۔ وہ شاید ایک دوسرے سے یہ کہہ رہے تھے۔ ''ہم نے چنگیز اور ہلاکو کی دعوتیں اڑائی ہیں۔ لیکن اہنسا پر مو دھر کی وسیع دستر خوان پر ہم نے جو فراوانی دیکھی ہے، وہ پہلے کبھی نہ تھی۔ چنگیز اور ہلاکو تو میز بانی کے آداب سے واقف ہی نہ تھے۔ وہ بسا اوقات ہمارے سامنے آہن پوش آدمیوں کی لاشیں پھینک دیتے تھے اور ان کے آہنی لباس کے باعث ہمارا کام بہت مشکل ہو جاتا تھا لیکن ہمارے یہ میز بان لاشوں کے کپڑے بھی نوچ ڈالتے ہیں، پھر ان کے ٹکڑے کر دیتے ہیں تاکہ ہمیں تکلیف نہ ہو اور پھر اس زمانے میں تو زیادہ تر سخت گوشت والے مردوں کو ہی قتل کیا جاتا تھا لیکن بھارت ماتا کے دستر خوان پر عورتوں اور بچوں کے گوشت کی فراوانی ہے............ وہ تاریک زمانہ تھا مگر اب دنیا بدل چکی

ہے۔اب بھارت کے بیٹے گدھوں کے مزاج سے واقف ہو چکے ہیں ...... کہو بھارت ماتا کی جے!''

راستے میں ان لوگوں کی ٹولیاں ملیں جو دریا کا رخ کر رہے تھے۔سلیم گھوڑا روکتا اور ان سے ڈاکٹر شوکت کے گاؤں کا حال پوچھتا لیکن کسی کو اپنا ہوش نہ تھا...... اسے عام طور پر اس قسم کے جواب ملتے۔

''میرا باپ اندھا ہے اور میں اسے فلاں جگہ چھوڑ آیا ہوں۔''

''میرے اتنے بچے تھے،ایک کرن میں ڈوب گیا اور باقی دوسرے کنارے پر پڑے ہوئے ہیں۔''

''میں اپنے خاندان کی لاشیں دفن نہیں کر سکا۔''

''مجھے تو اپنے گھر کے کسی آدمی کا پتہ نہیں!''

''تم نے راستے میری بہن تو نہیں دیکھی؟اس کے دوپٹے کا رنگ یہ تھا۔اس کی شکل ایسی تھی۔''

''آگے مت جاؤ۔آگے مت جاؤ!''

ایک گاؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔شام ہونے کو تھی۔سلیم نے گھوڑے کو روکا۔اس کے ایک ساتھی نے کہا۔'' اب ہر گاؤں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔شام ہونے والی ہے،ہم سب کو نہیں بچا سکتے۔ ہمیں پہلے ان کی خبر لینی چاہیے۔''

''نہیں ہم انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''یہ کہتے ہوئے سلیم نے گھوڑے کی باگ

گاؤں کی طرف موڑلی۔

گاؤں کے لوگ چند مکانوں کی چھتوں پر جمع ہو کر حملہ آوروں پر اینٹیں برسا رہے تھے اور سکھوں اور ہجوم ان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ دو سکھ کچھ دور پیچھے ہٹ کر بندوقوں سے فائر کر رہے تھے۔ داؤد نے ان کے عقب میں نمودار ہو کر ٹامی گن سے فائر کیے، ایک گر پڑا اور دوسرا بھاگ کر ایک مکان کی آڑ میں روپوش ہو گیا۔ سلیم اور باقی آدمی گھوڑے بھگا کر آگے بڑھے اور جتھے پر گولیاں برسانے لگے۔ سکھ بھاگ نکلے۔ چند لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح مسلمانوں نے انہیں پسپا ہوتے دیکھ کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور چھتوں سے چھلانگیں لگا کر ان کا تعاقب کرنے لگے۔

باقی عورتیں اور مرد اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے لیکن سلیم اور اس کے ساتھ ایک لمحہ توقف کے بغیر گھوڑے دوڑاتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے۔ لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔ ''یہ کون تھے؟ یہ ٹھہرے کیوں نہیں؟''

ایک سفید ریش آدمی انہیں سمجھا رہا تھا۔ ''یہ رحمت کے فرشتے تھے۔ یہ پاکستان کے سپاہی تھے۔''

اس گاؤں سے آگے کوئی ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سلیم نے ایک چوراہے پر اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ وہی راستہ ہے جو پکی سڑک سے اترتا ہے، اب ہمیں دائیں طرف مڑنا چاہیے۔''

داؤد نے کہا۔ ”رات ہونے والی ہے، ہمیں تسلی کر لینی چاہیے۔“

تھوڑی دور موٹروں کی آواز آ رہی تھی۔

داؤد بولا۔ ”ہم سڑک کے بالکل قریب آ نکلے ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو، میں پانچ منٹ میں سڑک پر میل کا نشان دیکھ کر آتا ہوں۔ وہاں سے مجھے اندازہ ہو جائے گا۔“

سلیم نے گھوڑے کی باگ موڑی ہی تھی کہ اس کا ایک ساتھی چلایا۔ ”ٹھہرو! کوئی سوار اس طرف آ رہا ہے۔“

پگڈنڈی پر تیز رفتار گھوڑے کی ٹاپ سن کر سلیم اور اس کے ساتھی کسی غیر متوقع خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ شام کے دھندلکے میں انہیں ایک سوار دکھائی دیا۔ اپنے ساتھیوں کو اس کی طرف بندوقیں سیدھی کرتے ہوئے دیکھ کر سلیم نے کہا۔ ”ٹھہرو! وہ شاید کوئی مسلمان ہو۔ ایک سکھ اس طرح پانچ آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

تھوڑی دیر میں وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ایک بیس بائیس سالہ نوجوان کو دیکھ رہے تھے، وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ اور دوسرے میں برچھی تھی۔ سوار نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی باگ کھینچی اور گھوڑا دو تین بار تیخ پا ہونے کے بعد رک گیا۔ سوار نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”تم نے میرے گاؤں کو بچایا ہے، میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔“

سلیم نے جواب دیا۔ ”ہم اپنا فرض ادا کیا ہے، تم پر احسان نہیں کیا۔“

”میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ بندوقیں کہاں سے ملتی ہیں؟ گاؤں سے ایک زخمی سکھ کی بندوقیں ہمیں مل گئی ہے۔ اگر ہمیں پانچ چھ اور بندوقیں مل جائیں تو ہم آخری دم تک سکھوں کا مقابلہ کریں گے۔ اگر کہیں سے قیمت پر بھی ملتی ہوں تو ہم اپنی عورتوں کا تمام زیور اتار کر دینے کے لیے تیار ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”کاش! ہم چند مہینے پہلے اس طرح سوچ سکتے۔“

نوجوان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”چند مہینے پہلے ہمیں یہ علم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ یہ فریب ہوں گے۔ ہمارے علاقے کے لیڈر تو اعلان سے ایک دن پہلے بھی یہ کہتے پھرتے تھے کہ ہماری تحصیل پاکستان میں جائے گی۔ ہم یہاں سکھوں اور ہندوؤں سے دوگنا زیادہ تھے لیکن اب باتوں سے کیا فائدہ؟ ہم بندوقیں لینا چاہتے ہیں اور ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہماری غیرت ہمیں ان وحشیوں کے آگے بھاگنے کی اجازت نہیں دے گی۔ تم لوگوں نے چند فائر کیے اور وہ بھیڑوں کی طرح بھاگ نکلے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ، بندوقیں کہاں سے ملتی ہیں؟ یہ لو میری بیوی، میری بہنوں اور میری ماں کا زیور ہے اور اگر تم کہیں سے پانچ رائفلوں کا بندوبست کر سکو تو میں اپنے گاؤں کی ہر عورت کا زیور اتروا کر دینے کے لیے تیار ہوں۔“

نوجوان اپنی جیب سے ایک پوٹلی نکال کر سلیم کی طرف بڑھا رہا تھا۔ سلیم نے کہا۔ ”میرے بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم قوم کی عزت کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں۔ ہمیں بندوقوں کی منڈی کا علم نہیں۔ اب بندوقیں حاصل کرنے کے

لیے صرف ہمت کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہ بندوقیں سکھوں اور ہندوستانی فوج کے سپاہیوں سے چھینی ہیں۔ میں تمہیں اس وقت ایک پستول دے سکتا ہوں۔ یہ لو۔ یہ بھرا ہوا ہے، میرے پاس اس وقت اور گولیاں نہیں لیکن اگر تم اس کا صحیح استعمال کر سکو تو شاید تمہیں ان پانچ گولیوں کے عوض پانچ بندوقیں مل جائیں۔ اب تم جاؤ، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

"آپ کہاں جائیں گے؟"

"تم ڈاکٹر شوکت کو جانتے ہو؟"

"انہیں کون نہیں جانتا!"

"ان کے گاؤں کا یہی راستہ ہے نا؟"

"نہیں! وہ راستہ آپ کو آگے چل کر ملے گا لیکن سوچنے کی ضرورت نہیں، آپ میرے پیچھے آئیں۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے؟"

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "میں بندوق حاصل کرنے سے زیادہ تمہارا ساتھ دینے کے لیے تمہارے پیچھے آیا ہوں۔"

نوجوان نے تھوڑی دور جا کر سلیم کی طرف مڑ کر دیکھا اور سوال کیا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"ہم ضلع گورداسپور سے آئے ہیں!"

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ ہاں الیکشن کے دنوں میں!"

''ہاں ان دنوں میں نے اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔''

''آپ کا نام سلیم ہے نا؟''

''ہاں!''

''میرا نام امیر علی ہے، آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں دو دن آپ کے ساتھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے رشتہ دار ہیں؟''

''ہاں! اب گاؤں کتنی دور ہوگا؟'' سلیم نے گفت گو کا موضوع بدلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے ایک کوس ہوگا۔''

سلیم کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ تصور میں گاؤں کے مختلف مناظر دیکھ رہا تھا۔ کبھی اسے عصمت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو دکھائی دے رہے تھے، کبھی وہ اس کی جگہ دوز چیخیں سن رہا تھا۔ کبھی وہ تصور کر رہا تھا کہ وہ سب کھلے صحن میں اس کی گرد جمع ہو کر طرح طرح کے سوال پوچھ رہے ہیں۔ کبھی وہ ملبے کے ڈھیر پر کھڑا ہو کر انہیں آوازیں دے رہا تھا۔

''ٹھہرو!'' امیر علی نے اچانک گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔

سلیم نے چونک کر باگ کھینچ لی۔ امیر علی نے جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر دیکھو!''

سلیم جو چند قدم آگے نکل گیا تھا، گھوڑا موڑ کر اس کے قریب آیا اسے زمین پر ایک لاش دکھائی دی۔ سلیم نے جلدی سے تھیلے سے ٹارچ نکال کر اس پر روشنی ڈالی۔

داؤد نے گھوڑے سے اتر کر لاش کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ''یہ لاش آج کی نہیں، اس سے بو آرہی ہے!''

امیر علی نے کہا۔ ''ادھر دیکھو، وہ گاؤں ہے۔ وہ اونچا درخت ڈاکٹر شوکت کے گھر کی نشانی ہے۔''

سلیم نے پر امید ہو کر کہا۔ ''گاؤں محفوظ ہے، وہاں آگ نہیں۔ چلو جلدی کرو!''

امیر علی نے کہا۔ ''اب گھوڑے سے آہستہ کر لو ممکن ہے گاؤں سے باہر دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہوا ہو۔''

چند قدم اور چلنے پر انہیں اور لاشیں نظر آئیں۔ امیر علی نے گھوڑا روکتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا۔ ''میرے دوست گاؤں پر حملہ ہو چکا ہے!''

سلیم چلایا۔ ''نہیں، نہیں!'' تاہم وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کے خیال کی تردید کرنے سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہے!''

تھوڑی دور آگے چل کر انہیں گاؤں سے باہر ڈاکٹر شوکت کے مکان کی چار دیواری نظر آنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی آس پاس کے کھیتوں میں جگہ جگہ لاشیں دکھائی دینے لگیں۔

امیر علی نے قبرستان کے پاس بیری کے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے گھوڑا روک کر نیچے کودتے ہوئے کہا۔ ''گھوڑے یہاں باندھ دو۔ ہم آگے پیدل جائیں گے۔ ایک آدمی گھوڑوں کے پاس رہے۔''

سلیم نے کہا۔ ''تم یہاں ٹھہرو۔ ہم جاتے ہیں۔''

امیر علی نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی حکم عدولی نہیں کرتا لیکن میرا ساتھ جانا ٹھیک ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں بندوق چلانا نہیں جانتا!''

سلیم نے اپنے ایک ساتھی کو گھوڑوں کے پاس ٹھہرا دیا اور امیر علی سے کہا۔ ''تم اس کی رائفل لے لو اور پستول اسے دے دو۔''



ڈاکٹر شوکت کے مکان سے باہر بھی کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ صحن کے پھاٹک کا دروازہ کھلا تھا لیکن سلیم کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ چند ثانیے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا رہا۔ پھاٹک سے آگے صحن میں بھی لاشیں نظر آ رہی تھی۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے شاہراہ حیات کی آخری مشعل بجھ چکی تھی۔ اس کے آسمان کے ستاروں کی گردش میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ آس پاس بکھری ہوئی لاشوں کا سکوت اس کے لیے آگ کے شعلوں، بندوقوں کے شوار اور تلواروں کی چمک سے زیادہ بھیانک تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی لیکن اس کے دل کی خفیف دھڑکنیں، ''عصمت! عصمت!! عصمت!!!'' پکار رہی تھیں۔ عصمت کے نام میں ابھی تک زندگی کی حرارت تھی۔ سلیم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ ہلنے لگے۔ ''عصمت! عصمت!!'' وہ اچانک بلند آواز میں چلایا اور بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہو گیا۔ چند کتے جو ایک لاش کو جھنجھوڑ رہے تھے، اچانک بھاگ کر صحن سے باہر نکل گئے۔ سلیم نے تھیلے سے ٹارچ

نکالی اور جھک جھک کر صحن اور برآمدے میں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ مسلمانوں کے ساتھ کہیں کہیں سکھوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اچانک سلیم کے ہاتھ میں ادھر ادھر گھومتی ہوئی ٹارچ کی روشنی ایک چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ امجد کی لاش برآمدے کے ستون کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بازو دھڑ سے علیحدہ تھے۔ شاہ رگ اس طرح کٹی ہوئی تھی جیسے اسے لٹا کر ذبح کیا گیا ہو۔ دونوں باچھیں جبڑوں کے کونوں تک چیر دی گئی تھیں لیکن اس کی کشادہ پیشانی، اس کی خوبصورت ناک، اس کی آنکھیں جو ابھی تک کھلی تھیں، یہ کہہ رہی تھیں۔ ''مجھے غور سے دیکھو، میں امجد ہوں۔ میں عصمت اور راحت کا بھائی ہوں، میں وہ معصوم مسکراہٹ ہو جسے زندگی کے ہونٹوں سے نوچ لیا گیا ہے!''

برآمدے سے آگے کمرے کے دروازے کا ایک کواڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ دہلیز سے باہر اور اندر چند اور لاشیں پڑی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی لاشیں۔ سلیم کانپتے ہوئے ہاتھ سے ان پر روشنی ڈال رہا تھا۔ عورتیں زیادہ تر عمر رسیدہ تھیں۔ سلیم نے ٹارچ بجھا دی۔ اس کے منہ سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی ''عصمت! راحت!! ''اس کے جواب میں ایک مکان کی چھت سے کتے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

داؤد نے کہا۔ ''چلو اندر دیکھیں۔''

سلیم بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ داؤد نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ کمرے میں ان عورتوں کی لاشیں تھیں۔ جنہیں سلیم نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس سے آگے بیٹھک میں کھلنے والا دروازہ بھی ٹوٹا

ہوا تھا۔ سلیم کے دل اور دماغ کے وہ حصے مفلوج ہو چکے تھے جنہیں درد کا احساس ہوتا ہے، اب اس کے لیے کوئی چیز بھیانک نہ تھی۔ اس نے اچانک داؤد کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی او بیٹھک کے اندر داخل ہوا۔ بیٹھک میں کوئی نہ تھا۔ فرش کی دری پر کہیں کہیں خون کے دھبے تھے۔ بغل کے کمرے کا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی دہلیز کے آگے سکھوں کی دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ایک اور لاش تھی۔ سلیم نے ایک ہی نظر میں اسے پہچان لیا اور اسے دوسری نظر دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ عریانی، بے لبی اور مظلومیت کی یہ تصویر زبان حال سے کہہ رہی تھی۔ ''میری طرف مت دیکھو! میرے قریب مت آؤ۔ دنیا کے تمام چراغ بجھا دو۔ سورج، چاند اور ستاروں سے کہو کہ وہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جائیں تاکہ مجھے کوئی اس حال میں نہ دیکھ سکے۔

سلیم نے داؤد کو دھکا دے کر باہر نکال دیا اور باقی آدمیوں سے جو ابھی تک بیٹھک میں کھڑے تھے، کہا۔ ''تم یہیں رہو!''

ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے لاش کی طرف پیٹھ کر کے ٹارچ جلائی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک صندوق کھلا پڑا تھا لیکن وہ خالی تھا۔ چند کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن سلیم ان میں اپنے مطلب کی کوئی چیز تلاش نہ کر سکا۔ صندوق کے ساتھ ایک پلنگ پر پرانی دری بچھی ہوئی تھی۔ سلیم نے دری اٹھائی اور ٹارچ بجھا کر تاریکی میں ٹٹول ٹٹول کر پاؤں رکھتا ہوا پیچھے مڑا، اچانک اس کے پاؤں سے کوئی شے لگی اور وہ جھک کر ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ لاش کے بازو اور سر

کے بالوں کو چھونے کے بعد اس نے دری کو اس کے اوپر ڈال دیا۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ باہر نکلنے کے ارادے سے اس نے ٹارچ دوبارہ جلائی لیکن اس کے دل میں اچانک یہ خیال آیا، شاید یہ کوئی اور ہو۔ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو۔ اس نے جھک کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے دری کا ایک سرا اٹھا کر چہرے پر روشنی ڈالی۔ یہ وہی تھی عصمت اور راحت کی ماں...... اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، اس کا چہرہ بری طرح نوچا گیا تھا۔ امجد کی طرح اس کی آنکھیں بھی کھلی تھیں، ان میں ایک التجا تھی۔ ایک پیغام تھا...... یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں قوم کے بیٹوں سے کہہ رہی تھیں۔

"میں تمہاری غیرت ہوں...... تم میری عصمت کی قسم کھا سکتے ہو۔ میں وہ بہن ہوں، جس نے دمشق کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ محمدؒ بن قاسم کی تلوار کو میں نے بے نیام کیا تھا۔ سندھ میری خاطر فتح ہوا تھا۔ میں وہ ماں ہوں جس نے محمود غزنویؒ کو دودھ پلایا تھا۔ سومنات کے بت توڑنے والے مجاہد کو میں نے لوریاں دی تھیں۔ میں وہ بیٹی ہوں جس کی رگوں میں تیمور کا خون ہے۔ لال قلعہ میرے لیے تعمیر ہوا تھا۔ میں نے اس سرزمین پر صدیوں تک تیری فتح و نصرت کے گیت گائے ہیں۔ اے قوم! دیکھ میں کوئی ہوں!!

سلیم نے دوبارہ اس کے چہرے پر دری ڈال دی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے ایک بار پھر تمام کمروں میں چکر لگایا۔ ایک ایک لاش کو غور سے دیکھا۔ بعض

چہروں کو کرپانوں کی ضربوں سے اس طرح مسخ کر دیا گیا تھا کہ ان کے اصلی خدوخال کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ تاہم سلیم کے دل کی دھڑکنیں گواہی دے رہی تھیں۔ کہ عصمت اور راحت ان میں نہیں ہیں۔ ان میں جوان لڑکیوں کی لاشیں بہت کم تھیں۔ مکان کا کونہ کونہ دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ صحن میں پڑی ہوئی لاشیں دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے اس کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ داؤد نے اس کے کندے پر ہاتھ رکھ کر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سلیم! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے گھر کی طرح یہ گھر بھی اس گاؤں کے مسلمانوں کا آخری قلعہ تھا۔ اس کمرے میں تمہاری..........!''

''نہیں، وہ اس کی ماں تھی۔'' سلیم نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''چلو سلیم!''

''ٹھہرو، میں چھت پر دیکھ آؤں!'' سلیم سیڑھی کی طرف بڑھا اور اس کے ساتھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ چھت پر مسلمانوں کے ساتھ تین سکھوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ عصمت اور رحمت وہاں بھی نہ تھیں۔ سلیم کے ہاتھوں سے سہارے کا آخری تنکا چھوٹ چکا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہیں کہیں چھٹے ہوئے بادلوں میں سے ستارے جھانک رہے تھے۔ چاند کو ایک سیاہ بادل کا لحاف اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ اچانک سلیم چلایا۔

''امجد! تمہارے خون کی قسم! ماں تمہارے بکھرے ہوئے بالوں کی قسم! اب میرے ہاتھ نہیں کانپیں گے۔ اب میرے پاؤں نہیں

سلیم اور اس کے ساتھی بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال تھے۔ تھوڑی دیر میں ان کے لیے اس قدر پکا پکایا کھانا جمع ہو گیا جو ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ مجید کے لیے ایک عورت اپنی بھینس کا دودھ لے آئی۔ اور اس نے سلیم کے اصرار پر چند گھونٹ پی لیے۔ ایک آدمی نے اپنے چھکڑے پر لدی ہوئے سامان سے ایک لحاف اتار کر ایک جھاڑی کے نیچے بچھا دیا اور مجید کو اس پر لٹا دیا۔ عابدہ اور اس کی ماں اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

ملاحوں اور کشتیوں کا معاملہ سلیم کی توقع کے خلاف تھا۔ دوسرے کنارے پر کشتیاں موجود تھیں ملاح ذرا دور ہٹ کر ایک کیکر کے درخت کی چھاؤں میں حقے پی رہے تھے۔ لوگوں نے سلیم کو بتایا کہ دوسرے کنارے سے بعض لوگ ملاحوں کے ایجنٹ بن کر آتے ہیں اور اگر انہیں کوئی پانچ سو یا ہزار روپیہ دے دیتا ہے تو رات کے وقت اس کے بال بچوں کو کشتی پر بٹھا کر پار لے جاتے ہیں۔''

سلیم نے پوچھا۔ ''اس وقت ان کا کوئی ایجنٹ یہاں ہے؟''

ایک آدمی نے جواب دیا۔ ''نہیں وہ شام کو آتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے زیادہ آدمیوں کو نکالنا شروع کر دیا تو ان کی قیمت گھٹ جائے گی!''

ایک سفید ریش آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میرے پاس کل دو سو روپیہ نقد اور کوئی چار سو کا زیور تھا۔ وہ سب میں نے ان کے حوالے کر دیا لیکن اب وہ کہتے ہیں کہ تمہارے کنبے کے گیارہ آدمی ہیں، پانچ سو روپیہ اور دو!''

سلیم نے کہا۔ ''لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ اس وقت بھی مسلمانوں میں ایسے

ڈگمگائیں گے۔ تمہارا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ شہیدوں کی روحو! بارگاہ الٰہی میں دعا کرو کہ وہ تمہاری قوم کے جوانوں کے سینے آگ کے انگاروں سے بھر دے۔ وہ اس خاک کی تقدیس کو بھول نہ جائیں جس پر تمہارا خون گرا ہے، جس پر تمہاری عصمتیں لٹی ہیں۔ زمین و آسمان کے مالک، مجھے ہمت دے کہ میں یوم حساب کا انتظار کر سکوں۔''

یہ کہہ کر سلیم سجدے میں گر پڑا۔

وہ رکے ہوئے آنسو جنہیں کسی انسان کے سامنے بہانا اسے گوارا نہ تھا، اچانک اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ یہ اس کی ہچکیوں کا اثر تھا یا دعا کے الفاظ کی تاثیر تھی۔ امیر علی، داؤد اور اس کے باقی ساتھی بھی سجدے میں گر پڑے۔

اچانک گاؤں کے ایک طرف شور سن کر سلیم اٹھا اور اس کے ساتھی بھی سجدے سے سر اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ شراب سے بدمست آدمیوں کی چیخیں تھیں۔''

امیر علی نے کہا۔ ''وہ گاؤں سے باہر مان سنگھ کی حویلی میں ہوں گے۔ تم یہیں ٹھہرو! میں پتہ لگا کر آتا ہوں۔''

''نہیں ہم سب چلتے ہیں۔'' سلیم اپنے دل میں نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا۔ امیر علی ان کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ وہ گاؤں کے اوپر سے چکر کاٹتے ہوئے دوسری طرف پہنچے۔ اب چیخوں کے ساتھ قہقہوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ چری کے

کھیت کی طرف حویلی کی دیوار کے ساتھ آم اور شیشم کے درختوں کی ایک قطار تھی۔

امیر علی نے اپنے پیچھے آنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ ایک لمحہ چار دیواری کے اندر جھانکنے کے بعد اس نے نیچے اترتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''آدمیوں کی تعداد تیس چالیس سے زیادہ نہیں لیکن باہر سے اور آدمی داخل ہو رہے ہیں۔ آگے دیوار کے ساتھ ایک چھپر ہے، ہم اس کی چھت پر لیٹ کر فائر کر سکتے ہیں۔''



حویلی کے اندر سکھ اپنی گزشتہ بارہ گھنٹے کی فتوحات کا جشن منا رہے تھے۔ تیس چالیس سکھ زمین پر بیٹھے شراب اڑا رہے تھے۔ آٹھ دس آدمیوں کی ایک ٹولی نے شراب سے بدمست ہو کر ہڑبونگ مچا رکھی تھی۔ کوئی ناچ رہا تھا۔ کوئی فحش گانے گا کر اپنے ساتھیوں سے داد حاصل کر رہا تھا۔ دیوار میں کھونٹیوں کے ساتھ دو لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ ناچنے والے آدمیوں نے اپنے دو ساتھیوں کو پکڑ کر لالٹین کی روشنی میں کھڑا کر دیا۔ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ مان سنگھ کے گھر کی عورتیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں سکھ اپنے چار زرگرہ مذہبی لباس سے بھی آزادی حاصل کر چکے تھے۔

ایک عورت چلائی۔ ''انہیں ان کے سامنے کرو!''

ٹولی کے باقی آدمی انہیں دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔ یہاں دھندلی

روشنی میں چند عورتیں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک آدمی لالٹین اتار کر ان کے قریب لے گیا۔

ایک عورت کی آواز آئی۔ ''گیان سنگھ، تمہاری دلہنیں شرماتی ہیں، انہیں شراب پلاؤ!''

''ہاں بھابی، شراب لاؤ!''

ایک اور آدمی نے کہا۔ ''ہاں سب کو شراب پلاؤ۔'' باقی سکھ اس کی تائید کر رہے تھے۔

ایک آدمی نے ایک عورت کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''گیان سنگھ ایک گلاس ادھر دینا!''

دو آدمیوں نے تڑپتی اور چیختی ہوئی عورت کے بازو اور سر کے بال پکڑ لیے اور ایک اسے زبردستی شراب پلانے کی کوشش کرنے لگا۔ عورت کہہ رہی تھی۔ ''کتو! سورو! مجھے مار ڈالو...... مجھے مار ڈالو!''

''ٹھہرو! یہ اس طرح نہیں پیے گی!'' ایک سکھ آگے بڑھ کر اس کا لباس نوچنے لگا۔

دروازے کے پاس پڑا ہوا کوئی آدمی چلایا۔ ''ظالمو! خدا سے ڈرو۔ مان سنگھ مان سنگھ! خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔''

''ارے اس کتے کی جان بڑی سخت ہے۔ اسے پھر ہوش آ گیا ہے۔'' مان سنگھ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور رسیوں میں جکڑے ہوئے آدمی کو پاؤں سے ٹھوکر

مارتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر! تم پرائی عورتوں کو دیکھ کر مرے جا رہے ہوں، ابھی تو تمہاری لڑکیوں کی باری بھی آئے گی۔ تم اپنی بیوی کو بھی دیکھ کر بھی چیخیں مار رہے تھے۔ اب تمہاری لڑکیوں کا خالصتان بننے والا ہے۔ اب بھی اگر یہ بتا دو کہ تم نے زیور کہاں رکھا ہوا تو میں تمہاری لڑکیوں کو بچا سکتا ہوں!''

''میں نے سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا تھا!''

''بدمعاش! وہ تمہاری بیوی کا زیور تھا، میں لڑکی کے زیور کے متعلق پوچھتا ہوں۔ تم نے اس کی شادی کے لیے جو زیور بنوایا تھا، وہ کہاں ہے؟''

''وہ میں امرت سر سے نہیں لایا تھا!''

''بہت اچھا ڈاکٹر! میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن تم بھی میری ایک بات مان لو۔ میں نے اب تک تمہاری لڑکیوں کی حفاظت کی ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ان کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو جو تمہاری بیوی کے ساتھ ہوا ہے تو تم ان سے کہو وہ امرت چکھ لیں۔ میں تمہارا داماد بننے کے لیے تیار ہوں۔ بڑی لڑکی میرے گھر کی رانی ہوگی۔ چھوٹی لڑکی کو سرودل سنگھ اپنے گھر لے جانے کے لیے تیار ہے۔ تم بھی امرت چکھ لو ڈاکٹر! ہمارے گاؤں کو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے!''

ڈاکٹر چلایا۔ ''تم کتے ہو، تم سور ہو۔''

ایک آدمی نے لاٹھی اٹھائی لیکن مان سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دھکیل ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں ابھی نہیں گیان سنگھ! پچھلی کوٹھڑی سے ڈاکٹر کی لڑکیوں کو نکال لاؤ!''

ایک آدمی اندر داخل ہوا اور تھوڑی دیر میں دو لڑکیوں کو دھکیلتا ہوا باہر لے آیا۔

مان سنگھ نے کہا۔ ’’گیانی جی! امرت کا کٹورا لے آؤ۔‘‘

گیانی بولا۔ ’’سردار جی! انہوں نے پہلے دوبارہ امرت گرا دیا ہے۔ اب تسلی کر لو!‘‘

’’لاؤ گیانی جی! یہ ان کے لیے آخری موقع ہے۔ اب انہوں نے امرت گرایا تو ہمارے پاس شراب موجود ہے۔ ڈاکٹر! ابھی بھی وقت ہے، انہیں سمجھاؤ۔‘‘

ڈاکٹر لڑکیوں کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ ’’پروردگار! اب میں تجھ سے عزت کی موت مانگتا ہوں۔‘‘

لڑکیاں۔ ’’ابا جان!!‘‘ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھیں لیکن مان سنگھ ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور چلایا۔ ’’ٹھہرو! اگر اب بھی امرت چکھ لو تو تمہارے باپ کی جان بچ سکتی ہے۔ ڈاکٹر میں آخری بار تم سے کہتا ہوں کہ ان کو سمجھاؤ......!‘‘

ڈاکٹر گڑگڑا کر اپنی دعا دہرا رہا تھا۔ مان سنگھ نے گیانی کے ہاتھ سے کٹورا لیکر ایک لڑکی کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ’’لو یہ پی لو۔ میں تم سے آخری بار کہتا ہوں...... تم نہیں پیو گی۔ ٹھہرو! مکھن سنگھ او مکھن سنگھ! ذرا انکے سامنے تو آ!‘‘

ایک ننگ دھڑنگ، شراب سے بدمست سکھ آگے بڑھا اور لڑکیاں خوفزدہ ہو کر دیوار کی طرف سرکنے لگیں۔

مان سنگھ کے اشارے سے اس نے ایک لڑکی کو سر کے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کا لباس نوچنے لگا۔ دوسری لڑکی اس کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھی لیکن مان سنگھ نے

اسے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ لڑکی چیخیں مار رہی تھی۔ ڈاکٹر کی گڑگڑاتی ہوئی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ایک طرف بیٹھی ہوئی مسلمان عورتیں رو رو کر خدا سے دعائیں کر رہی تھیں کہ اچانک ''تڑتڑتڑ'' کی آواز آئی اور مکھن سنگھ، مان سنگھ اور ان کے گرد چند اور سکھ زمین پر گر پڑے۔

''وہ آ گئے! مسلمان فوج آ گئی!'' سکھ چیختے چلاتے باہر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ پھاٹک اندر سے بند تھا۔ انہوں نے گولیوں کی بارش میں کنڈی کھولی تو معلوم ہوا کہ کوئی باہر سے بھی کنڈی لگا چکا ہے۔

سلیم چھپر سے چھلانگ لگا کر حویلی میں داخل ہوا اور بلند آواز میں چلایا: ''فائر بند کرو!'' بندوقیں اچانک خاموش ہو گئیں۔

سلیم نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''بھاگنے کی کوشش بے سود ہے۔ فوج نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ تم لوگ ایک طرف ہو جاؤ۔ ہم اس مکان کی تلاشی لیں گے۔ تھوڑی دیر میں پولیس آ جائے گی، ہم تم کو ان کے حوالے کر دیں گے لیکن اس وقت تک اگر کسی نے ہاتھ بھی ہلایا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔''

سکھ جس قدر اچانک حملے سے بدحواس ہوئے تھے، اسی قدر پولیس کی آمد کی خبر سے مطمئن تھے۔ اس علاقے کا تھانیدار ان کے جتھیدار کا دست راست تھا۔

ایک کونے سے پانچ چھ آدمی دیوار پھاندنے کی کوشش کر رہے وہ سب کے سب وہیں ڈھیر ہو گئے۔ سلیم نے باقی آدمیوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب

کوئی اور ہے جو بھاگنا چاہتا ہے؟'' سکھ جواب دینے کی بجائے سمٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

سلیم نے بلند آواز میں کہا۔''جمعدار داؤد! تم دو نوجوانوں کے ساتھ اندر آ جاؤ۔ صوبیدار امیر علی! تم وہیں اپنی ڈیوٹی پر رہو۔ اگر وہاں کوئی آدمی نظر آئے تو اسے گولی مار دو......! جب تک پولیس نہیں آتی، ہم یہاں سے نہیں جائیں گے!''

داؤد دو آدمیوں کے ساتھ چھپرے سے چھلانگ لگا کر اندر آ گیا اور فوجی انداز میں سلام کرنے کے بعد سلیم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

سلیم نے کہا۔''جمعدار تم ان لوگوں کا خیال رکھو!''

ایک سکھ نے کہا۔''سرکار ہم بے قصور ہیں۔ یہ تمام لچائی مان سنگھ کی ہے۔''

''یہ باتیں پولیس والوں کو بتانا۔ مان سنگھ کون ہے؟''

''مان سنگھ ادھر پڑا ہوا ہے۔''

''اس کے گھر کا کوئی اور آدمی ہے؟''

''اس کا لڑکا ہے سرکار، ہم بے قصور ہیں۔''

''کون ہے اس کا لڑکا؟ ادھر آؤ، جلدی کرو، ڈرو نہیں۔''

ایک سولہ سال کا لڑکا جس کا شراب کسی حد تک اتر چکی تھی، کانپتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی اور کہا۔''چلو مجھے مکان دکھاؤ!''

لڑکا اس کے آگے چل دیا۔ دروازے کے قریب ایک عورت ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔''پرماتما کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو...... میں تمہیں سب

کچھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ میرے پاس جس قدر سونا ہے، لے لو۔"

سلیم نے کہا۔ "تم نے بندوقیں کہاں رکھی ہوئی ہیں؟"

"وہ اندر ہیں صندوق میں۔ بھگوان کے لیے، خدا کے لیے میرے بچے کو چھوڑ دو!"

سلیم نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "چلو اندر!"

دالان سے آگے کوٹھری میں ٹھکا ٹھک کی آواز آ رہی تھی۔ سلیم نے اچانک ٹارچ بجھا دی اور دبے پاؤں آگے بڑھا۔ کوٹھری کے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے ٹارچ دوبارہ جلائی۔ دو آدمی صندوق توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کرپان اٹھائی لیکن اتنی دیر میں سلیم کی ٹامی گن سے چند گولیاں نکل چکی تھیں۔ ایک ثانیہ کے بعد سلیم نے دالان سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "داؤد میں ٹھیک ہوں۔ تم ان آدمیوں کا خیال رکھو۔"

مان سنگھ کے لڑکے نے دوسری کوٹھری میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ سلیم نے واپس مڑ کر دروازے کو دھکا دیا۔ لڑکے کی ماں نے چیخیں مارتے ہوئے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "گورو مہاراج کی قسم! اس کوٹھری میں کچھ نہیں، میرے لڑکے کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں بندوقیں نکال دیتی ہوں۔"

سلیم نے کچھ سوچ کر دروازے کی کنڈی باہر سے بند کر دی اور عورت کو دوسری کوٹھری میں دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جلدی کرو!"

عورت دوسری کوٹھری کے دروازے کے قریب پہنچ کر دیوار ٹٹول رہی تھی۔ سلیم

نے اس کی طرف ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہی ہو تم؟''

صندوق کی چابی تلاش کر رہی ہوں۔ یہ ہے۔'' اس نے طاقچے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

عصمت اور راحت سلیم کی آواز پہچان چکی تھیں لیکن جب وہ چند قدم دور اندھیرے میں کھڑا فوجی افسر کے لب ولہجہ سے باتیں کر رہا تھا تو وہ یہ سمجھنے لگیں کہ یہ کوئی اور ہے۔ پھر جب وہ جمعدار اور صوبیدار کو ہدایات دینے لگا تو راحت نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپا میں جھی تھی کہ یہ سلیم بھائی ہیں۔''

''یہ وہی ہیں راحت! یہ وہی ہیں!'' عصمت نے راحت کو سمجھانے سے زیادہ اپنے دل کو تسلی دیتے کہا۔

اور پھر جب وہ اور قریب آ کر مان سنگھ کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا اور دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے لیمپ کی دھیمی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی راحت اپنے لباس کے پھٹے ہوئے چیتھڑوں کو سمیٹتی ہوئی عصمت کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ عصمت کے لیے اپنے دل کی دھڑکنیں ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخوں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ ''سلیم! سلیم!! تم آ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ ضرور آؤ گے۔ میں نے دعا مانگی تھیں۔ میں نے خواب دیکھے۔ سلیم! سلیم! میری طرف دیکھو، تم مجھے نہیں پہچانتے؟'' لیکن اس کے پاؤں کو جنبش نہ ہوئی اور الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اب وہ اپنے دل سے پوچھ رہی تھی۔ ''کیا اس نے

مجھے نہیں دیکھا؟ اس نے مجھے نہیں پہچانا؟'' پھر وہ ایک گرے ہوئے سکھ کی کرپان نکال کر اپنے باپ کی رسیاں کاٹنے لگی۔ وہ ہاتھوں کی رسیاں کاٹنے کے بعد پاؤں کی رسیاں کاٹ رہی تھی کہ اندر سے ٹامی گن چلنے کی آواز آئی۔ عصمت کے ہاتھ سے کرپان گر پڑی اور راحت خوفزدہ ہو کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ایک ثانیہ ک بعد جب سلیم نے دروازے سے جھانکتے ہوئے داؤد کو آواز دی تو عصمت کے دو بتے ہوئے داؤد کو آواز دی تو عصمت کے دو بتے ہوئے دل کی دھڑکنیں پھر بیدار ہو گئیں۔ راحت نے اس کے ہاتھ سے گری ہوئی کرپان اٹھالی اور ڈاکٹر کے پاؤں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ رسیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی ڈاکٹر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دبا کر بیٹھ گیا۔ راحت سمٹتی ہوئی باقی عورتوں کے پاس چلی گئی۔ کسی نے اپنی اوڑھنی اتار کر اس کی طرف پھینک دی اور وہ اسے اپنے کندھوں کے گرد لپیٹ کر بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ عصمت نے چند منٹ کے توقف کے بعد دیوار کی کھونٹی سے لالٹین اتاری اور اندر چلی گئی۔

اس عرصہ میں سلیم، مان سنگھ کی بیوی سے صندوق کھلوا کر دو رائفلیں ایک اسٹین گن اور ایک ٹامی گن، دو بارہ بور کی بندوقیں، ایک پستول دو نئی ٹارچیں اور کوئی بیس سیر کے لگ بھگ بارود نکلوا چکا تھا۔ ایک کونے میں جہاں سکھوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، پٹرول کے پندرہ بیس ٹین رکھے ہوئے تھے۔

باقی کوٹھڑی لوٹ مار کے سامان سے بھری ہوئی تھی اور مان سنگھ کی بیوی کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لیے یہ سب کھ لے جاؤ اور میری بچے کو کچھ نہ کہو۔''

"تم نے ابھی تک ساری بندوقیں ہمارے حوالے نہیں کیں؟"

وہ کہہ رہی تھی۔ "گرو مہاراج کی قسم! میں جھوٹ نہیں کہتی۔ انہوں نے باقی تمام ہتھیار تقسیم کر دیے تھے۔ صرف یہی تھے جو چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔"

سلیم نے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بارود اس میں ڈال دو۔ جلدی کرو۔"

عورت کسی حیل وحجت کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور سلیم ٹارچ کی روشنی میں کوٹھڑی کے ساز و سامان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کپڑے جو عورت نے سوٹ کیس سے نکال کر فرش پر پھینک دیے تھے قریباً سب کے سب سلک اور ساٹن کے نئے سوٹ تھے۔ ان بکھرے ہوئے کپڑوں کے درمیان اس کو ایک تصویر دکھائی دی۔ اس نے جھک کر تصویر کو اٹھا لیا۔ یہ امجد، ارشد، عصمت اور راحت کے بچپن کی تصویر تھی۔ اس نے بارود کے لیے ایک اور سوٹ کیس خالی کر دیا اور کپڑے اکٹھے کر کے دوبارہ چمڑے کے سوٹ کیس میں ڈال دیے۔

عصمت ہاتھ میں لیمپ لیے دروازے کے قریب پہنچی۔ سلیم نے ٹارچ بجھا کر ٹامی گن سنبھالتے ہوئے کہا۔ "کون ہے؟"

عصمت نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہوں عصمت!"

سلیم نے ٹامی گن نیچے کر لی اور عصمت دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیم نے کپڑوں کا سوٹ کیس اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں راحت اور چند عورتوں کو کپڑوں کی ضرورت ہے۔ آپ یہ لے

جائیں!"

عصمت نے سوٹ کیس لے کر سلیم کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "آپ کے گھر کے لوگ کہاں ہیں؟"

سلیم نے جواب دینے کی بجائے بارود سے بھرا ہوا بکس اٹھا کر دہلیز سے باہر رکھ دیا اور کہا۔ "آپ پہلے اپنا سوٹ کیس چھوڑ آئیں اور پھر یہ لے جائیں!"

عصمت نے کہا۔ "لیکن میں نے آپ کے خاندان کے متعلق پوچھا تھا؟"

سلیم بولا۔ "عصمت! باتوں کا وقت نہیں۔" اور عصمت کو دوبارہ سوال کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ یکے بعد دیگرے دونوں سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے گئی۔ دوسرے پھیرے میں ڈاکٹر اور چند عورتیں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر نے ہتھیار اٹھا لیے اور عورتیں سلیم کے کہنے پر پٹرول کے ڈبے اٹھا کر باہر لے گئیں۔

سلیم نے باہر نکل کر ڈاکٹر شوکت سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ عورتوں کو لے کر ایک طرف ہٹ جائیں۔"

ڈاکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ "آپ احتیاط کریں، شاید ان میں سے کسی کے پاس پستول ہو!"

"آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہنے کے بعد سلیم ایک طرف ہٹ کر سکھوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ جائیں پولیس نے دیر لگا دی ہے، شاید وہ صبح کو آئے۔ اس لیے تم لوگ اندر جا کر بیٹھ جاؤ!"

سکھ تذبذب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سلیم نے کہا۔ "

جمعدار داؤد! تم ان آدمیوں کو اندر بند کر دو اور دروازے پر دو آدمیوں کا پہرہ بٹھا دو ...... آٹھ آدمی حویلی کے گرد پہرہ دیں گے۔ میں نے مکان سے اسلحہ نکال لیا ہے، اس لیے انہیں اندر بھیج دینے میں کوئی خطرہ نہیں۔"

سکھ اب ایک دوسرے سے دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ داؤد نے گرج کر کہا۔"بدمعاشو جلدی کر دو ورنہ ہم ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

چند آدمی دروازے کی طرف بڑھے اور آٹھ دس قدم دور جا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔

سلیم بولا۔"جمعدار! یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔ میں تیس تک گنتی گنتا ہوں۔ اس کے بعد تم چلا دو۔ اگر یہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی مارے جائیں تو غلطی ان کی ہو گی۔"

سلیم نے گنتی شروع کی۔"ایک ...... دو ...... تین ......!"

مان سنگھ کی بیوی نے بلند آواز میں کہا۔"بھائیو ڈرو نہیں! انہوں نے ہردیپ کو کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے باوا سنگھ اور ہرنام سنگھ کو مارا ہے، وہ کوٹھڑی میں ہمارا صندوق توڑ رہے تھے۔" باقی عورتیں بھی اپنے باپوں، خاوندوں بھائیوں اور بیٹوں کو اندر جانے کی ترغیب دینے لگیں۔

سلیم نے بارہ تک گنتی گنی تو آٹھ دس سکھ اندر چلے گئے۔ جب وہ پچیس تک پہنچا تو تمام سکھ اندر جا چکے تھے۔ دالان کے دو دروازے تھے، داؤد ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اسٹین گن دکھا کر سکھوں کو پیچھے ہٹا دیا، اور اس کے ایک ساتھی

نے جلدی سے دروازہ بند کر کے باہر کی کنڈی لگا دی دو دروازوں کے درمیان ایک آہنی سلاختوں والی کھڑکی تھی اور چند سکھ اس کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باہر جھانک رہے تھے۔ امیر علی چھپر سے اتر کر آگے بڑھا اور اس نے آتے ہی کھڑکی میں سے جھانکنے والے ایک سکھ کے منہ پر سنگین ماری۔ وہ گرا اور باقی سکھوں نے شور مچاتے ہوئے کھڑکی بند لی۔

جب سلیم کے ساتھی کھڑکی اور دروازے پر پٹرول چھڑکنے لگے تو مان سنگھ کی بیوی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ "خدا کے لیے! میرے ہر دیپ کو نکال لو۔" اس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مسلمان عورتوں میں سے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے مان سنگھ کی بیوی کو دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اس کتیا کے لڑکے نے امجد کی لاش کے ٹکڑے کیے تھے اور اس کے خاوند نے امی جان کو...... !" لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ راحت تھی۔

داؤد نے سٹین گن کی نالی مان سنگھ کی بیوی کے منہ پر رکھ دی لیکن سلیم نے چلا کر کہا۔ "نہیں داؤد، اسے چھوڑ دو۔ ہم جنگ میں دوسروں کے اصولوں کی پیروی نہیں کریں گے۔"

سلیم نے جلتا ہوا لیمپ اٹھا کر دروازے کے ساتھ دے مارا۔ اچانک آگ کا ایک مہیب شعلہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

سکھوں کی عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے۔ سلیم نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جس زمین پر تمہاری قوم نے آگ بوئی ہے، وہ تمہارے لیے پھول پیدا نہیں کرے گی۔"

کسی نے اندر سے کھڑکی کھولی اور اچانک پستول کے فائر کی آواز آنے لگی۔ ایک گولی سلیم کے بازو کے ساتھ مس کرتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری مان سنگھ کی بیوی کے سینے میں لگی۔ سلیم اور داؤد نے بیک وقت ٹامی گن اور اسٹین گن سے فائر کیے اور آگ کے شعلے کے پیچھے چند سکھ ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

عصمت نے آگے بڑھ کر سلمیٰ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''میں ٹھیک ہوں عصمت! میں ٹھیک ہوں!''

دالان کی ایک دیوار کے ساتھ اپلوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سلیم نے اس پر بھی پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ صحن میں چند شراب کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ امیر علی انہیں اٹھا اٹھا کر جلتی ہوئی کھڑکی کی طرف پھینک رہا تھا۔ آگ کی روشنی سے صحن چکا چوند ہو چکا تھا۔ ایک طرف بندھے ہوئے چار گھوڑے بدحواس ہو کر آگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سلیم نے کہا۔ ''چلو داؤد! یہ سب گھوڑے لے لو۔ امیر علی! یہ تمام ہتھیار تمھارے ہیں، ہم صرف آدھا بارود لیں گے۔''

امیر علی نے جواب دیا۔ ''ان ہتھیاروں کے ساتھ میں اردگرد کے تمام گوردواروں کا سارا بارود میں یہاں جمع کرلوں گا۔''

سلیم نے کہا۔ ''تم ٹامی گن اور اسٹین گن چلانا جانتے ہو؟''

''ہمارے گاؤں کے چار آدمی سپاہی ہیں۔''

وہ حویلی سے باہر نکلے تو عصمت نے کہا۔ ''آپ ہمارے گھر سے ہو کر آئے تھے؟''

''ہاں!''سلیم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ نے امی اور امجد......''اس کی آواز بیٹھ گئی۔

''میں سب کچھ دیکھ آیا ہوں۔ارشد ابھی تک دہلی میں ہے؟''

''جی ہاں!''عصمت نے جواب دیا۔

راحت نے سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔''بھائی جان!امی اور امجد کی لاشیں......!''

سلیم بولا۔''وہاں بہت سی لاشیں تھیں۔وہ تنہا نہیں۔میں نے ہر قدم پر لاشوں کے انبار دیکھے ہیں۔یہ وہ مقدس امانتیں ہیں جو ہم اس سرزمین پر چھوڑے جا رہے ہیں۔''

راحت نے کہا۔''بھائی جان آپ کے خاندان کے لوگ......؟''

سلیم راحت کا سوال کا جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

''ڈاکٹر صاحب!آپ زخمی ہیں۔آپ ایک گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔''

''نہیں۔میں چل سکتا ہوں آپ ان عورتوں کو......''

''آپ ان کی فکر نہ کریں۔گاؤں سے باہر ہمارے گھوڑے کھڑے ہیں۔وہاں پہنچ کر عورتیں سوار ہو جائیں گی۔''

گاؤں سے باہر ان کا ساتھی جسے وہ گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے تھے، بے چینی سے ان کا اانتظار کر رہا تھا۔چار تازہ دم گھوڑے مل جانے سے ان کے پاس نو گھوڑے ہو چکے تھے۔امیر علی کا گھوڑا ان کے علاوہ تھا۔عورتوں کی تعداد تیرہ تھی،

اس لیے چند گھوڑوں پر دو دو عورتوں کو لاد دیا گیا۔ جو گھوڑے ذرا سرکش نظر آئے، ان کی باگیں مردوں نے پکڑ لیں۔

چاند غروب ہو چکا تھا اور ستاروں کو تاریک بادل اپنی آغوش میں لے چکے تھے۔ امیر علی اس قافلے کا رہنما تھا اور وہ انہیں ان راستوں سے بچا کر لے جا رہا تھا، جہاں سکھوں کے حملے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ امیر علی کے گھوڑے پر ڈاکٹر صاحب سوار تھے اور انہوں نے امیر علی کے حصے کا اسلحہ اور بارود سنبھال رکھا تھا۔ سلیم کے گھوڑے پر عصمت اور راحت تھیں اور وہ باگ پکڑ کر آگے آگے چل رہا تھا۔

اپنے گاؤں پہنچ کر امیر علی نے سلیم سے کہا۔ ”یہ سب بہنیں بھوکی ہیں۔ دریا پر کیمپ سے شاید اس وقت آپ کو کچھ نہ ملے۔ اس لیے آپ تھوڑی دیر ہمارے گاؤں میں ٹھہریں۔ جو کچھ اس وقت ہو گا، ہم حاضر کر دیں گے۔“

سلیم نے کہا۔ ”بھئی! اب ہماری ہمت جواب دے چکی ہے، اگر تمہارے گاؤں میں بیٹھ گئے تو دوبارہ اٹھنا مشکل ہو گا۔“

”میں آپ کو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہراؤں گا۔ گھر میں اچار اور مکھن ضرور ہو گا۔ اگر باسی روٹیاں نہ ملیں تو آدھے گھنٹے میں تازہ پک جائیں گی، زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

عورتوں کی خاموشی ان کی بھوک کا پتہ دے رہی تھی۔ سلیم نے کہا۔ ”بہت اچھا۔“

امیر علی کے گاؤں سے کھانا کھانے کے بعد یہ لوگ کوئی دو بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ امیر علی انہیں کیمپ میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

کیمپ میں دو ہزار نئے انسانوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ پہرا دینے والے نوجوانوں سے باتیں کرنے کے بعد سلیم کو معلوم ہوا کہ ملاحوں نے رات کے بارہ بجے تک کشتیاں چلائیں ہیں اور اب تھکاوٹ سے چور ہو کر دوسرے کنارے سو رہے ہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "لیکن میں نے کہا تھا کہ جب وہ تھک جائیں تو ان کی جگہ کیمپ کے وہ آدمی کام کریں جو کشتیاں چلانا جانتے ہیں۔"

پولیس کے ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "میاں صاحب! انہوں نے تھوڑی دیر کام کیا۔ لیکن ہم سے غلطی ہوئی ہم نے ان کو بال بچے پار لے جانے کی اجازت دے دی۔ جب ان کے بال بچے پار پہنچ گئے تو انہوں نے اس طرف مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ فقیر دین ملاح نے دیر کام کیا ہے۔ وہ آپ کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے آخری پھیرا لے گیا ہے۔ تھکاوٹ سے اس کا برا حال تھا۔ میں نے اسے خود کہا ہے کہ وہ اب جا کر آرام کرے۔"

سلیم ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ "ڈاکٹر صاحب! اگر یہ خواتین ابھی پہنچ جاتیں تو میرے دل سے ایک بوجھ اتر جاتا۔ میں جا کر کشتی لاتا ہوں، آپ کنارے پر کھڑے رہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "سلیم! تم بہت تھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب، صبح اور بہت سے کام ہوں گے۔"

ایک جفاکش سپاہی ہونے کے باوجود داؤد کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ تاہم اس نے کہا۔ "سلیم! اگر کشتی لانا اسی وقت ضروری ہے تو میں جاتا ہوں۔ تم بہت

زیادہ تھک گئے ہو۔‘‘

سلیم نے جواب دیا۔ ’’میں اپنے گھوڑے کے ساتھ دریا عبور کرتا ہوں۔‘‘

راحت نے کہا۔ ’’نہیں بھائی جان! اس وقت نہ جائیے۔‘‘

لیکن سلیم کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور دریا میں اتر گیا۔ گہرے پانی میں پہنچ کر اس نے گھوڑے کی زین پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ اندھیرے میں روپوش ہو چکا تھا۔

ایک گھنٹہ نہیں گزرا تھا کہ اس کے ساتھی ایک کشتی کو کنارے کی طرف آتا دیکھ رہے تھے۔ کشتی کنارے پر آ گی۔ داؤد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ فقیر دین کے ساتھ ایک اور ملاح تھا۔ اس نے سوال کیا۔ ’’سلیم وہیں رہ گیا؟‘‘

فقیر دین نے جواب دیا۔ ’’سلی کشتی میں بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ وہ کشتی پر بیٹھتے ہی سو گیا تھا۔‘‘

داؤد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، سلیم کشتی کے ایک کونے میں پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔

فقیر دین نے کہا۔ ’’اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ جگاؤ مت۔ میں صبح اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ یہ بہت تھکا ہوا ہے۔‘‘

’’بہت اچھا، ڈاکٹر صاحب! آپ کشتی پر سوار ہو جائیں!‘‘ یہ کہہ کر داؤد اونگھتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ دو تین بار جمائی لینے کے بعد اس نے بھی ٹانگیں زمین پر پھیلا دیں۔

عورتیں کشتی پر بیٹھ گئیں۔ عصمت نے کشتی پر پاؤں رکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ ''ابا جان! اس آدمی سے پوچھیے۔''

ڈاکٹر شوکت نے داؤد کے قریب آ کر کہا۔ ''آپ کو سلیم کے خاندان کے متعلق کچھ معلوم ہو تو مجھے بتائیے!''

داؤد اس سوال کا جواب دینے کی بجائے سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے بڑبڑایا ''اگر حملہ ہو تو مجھے جگا دینا۔''

ڈاکٹر نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ''دیکھیے میں سلیم کے خاندان کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں!''

''وہاں صرف سلیم کا خاندان نہیں تھا۔ وہاں بہت سے خاندان تھے۔ حملہ ہو تو مجھے جگا دینا......'' داؤد بڑبڑاتا ہوا منہ کے بل لیٹ گیا...... سلیم کے باقی تمام ساتھی دریا کے کنارے پہنچتے ہی سو گئے تھے۔

پولیس کے سپاہی نے کہا۔ ''کوئی اچھی خبر ہوتی تو سلیم خود آپ کو بتا دیتا۔''

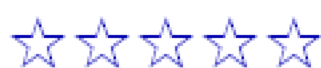
''تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

سپاہی نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! یہ سننے اور سنانے کی باتیں نہیں، یہ لوگ اپنے پیچھے صرف راکھ چھوڑ کر آئے ہیں۔''

ملاح آوازیں دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کوئی اور بات کیے بغیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کشتی پر سوار ہو گیا۔

راحت نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''ابا جان! کیا کہتا ہے وہ؟''

''کچھ نہیں۔'' ڈاکٹر نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔



آسمان پر امڈے ہوئے بادلوں سے ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں۔ سلیم کروٹ بدل کر منہ کے بل لیٹ گیا۔ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''سلیم! سلیم!!''

سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجید! مجھے تنگ نہ کرو۔ میں ابھی سویا ہوں۔ چچی جان! مجید کو منع کرو۔''

''سلیم اب دس بجنے والے ہیں۔''

''اونہہ! دس بجنے والے ہیں۔ تم ہمیشہ مجھے تنگ کرتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے سلیم نے دوبارہ کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ دریا کے کنارے ریت پر پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شوکت، عصمت اور راحت اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اُف! شاید میں خواب دیکھ رہا تھا.......... میں شاید کشتی لینے آیا تھا.......... اس کے بعد.......... میں شاید کشتی پر سو گیا تھا!''

کچھ دیر آنکھیں ملنے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ملاح دوسرے کنارے سے کشتیاں بھر بھر کر لا رہے تھے۔ قریب ہی دریا کے کنارے اس کا گھوڑا چر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''سلیم بیٹا! تم کشتی پر سو گئے تھے۔ ہمیں اس پار لانے کے بعد

ملاحوں نے تمہیں اٹھا کر یہاں لٹا دیا تھا!''

سلیم نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ جو عورتیں تھیں، وہ..........''

''وہ ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئی ہیں!''

''آپ کیوں نہیں گئے؟''

''تم بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ میں نے تمہیں آٹھ بجے کے قریب جگانے کی کوشش کی۔ لیکن تم نیند میں بے ہوش تھے۔ وہ عورتیں اگلے گاؤں میں ہمارا انتظار کریں گی۔ ہم تھوڑی دیر میں ان کے ساتھ جا ملیں گے۔ اب اٹھو!''

سلیم نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ میرا گھوڑا لے جائیں!''

راحت نے کہا۔ ''بھائی جان! آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟''

''نہیں راحت، میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا!''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں بھی نہیں جانا چاہتا سلیم! میں ان کے لیے سواری کا بندوبست کر کے واپس آ جاتا ہوں۔''

''یہ جگہ آپ کے لیے نہیں ڈاکٹر صاحب، اب تک لاہور اور دوسرے شہروں میں ہزاروں زخمی پہنچ چکے ہوں گے، آپ کے لیے وہاں بہت کام ہو گا۔ یہاں ہمیں بندوقوں کی ضرورت ہے۔ یہاں ہمیں لوگوں کو پار پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کشتیوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مغربی پنجاب کے وزیروں اور لیڈروں سے مل کر کوئی بندوبست کر سکیں تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔ ہندوستانی فوج اور سکھوں کے جتھے اگر آج نہیں تو کل حملہ کریں گے، ہمیں اگر دو مشین گنیں اور سپاہیوں کا ایک دستہ مل

جائے تو ہم اس کیمپ کی حفاظت کر سکیں گے ۔ لیڈروں سے یہ بھی کہیے کہ راوی کے پل پر مسلمان سپاہی متعین ہونے چاہیں ۔ ڈوگرہ اور سکھ سپاہیوں کے ہاتھوں پاکستان کی عین سرحد پر مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے ۔"

"میں کوشش کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ مغربی پنجاب کے لیڈر اب بیان بازی میں مشغول ہوں گے ۔ اب تک خدا معلوم مشرقی پنجاب سے کتنے پناہ گزین وہاں پہنچ چکے ہوں گے ۔ اگر وہ انہی کو سنبھال سکے تو یہ ایک بہت بڑا کام ہو گا ۔"

"آپ فوج کے مسلمان افسروں سے ملیں ۔ انہیں بتائیں کہ باؤنڈری فورس کے ہندو اور سکھ اب اکال سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیے ہراول کا کام دے رہے ہیں ۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "باؤنڈری فورس کی تشکیل میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کا عنصر ماؤنٹ بیٹن، ریڈ کلف، پٹیل اور تارا سنگھ کے پروگرام کی تکمیل میں مزاحمت نہ ہو........ چند دنوں تک شاید بلوچ رجمنٹ کو بھی مشرقی پنجاب سے تبدیل کر دیا جائے ۔"

سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ طوفان مشرقی پنجاب کے بعد کشمیر کا رخ کرنے والا ہے ۔ کشمیر کے متعلق کسی اقدام کی ضرورت ہے ۔ انہیں جھنجھوڑیے، انہیں جگائیے! مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ پٹیل اور تارا سنگھ کے بھیڑیوں کے لیے کشمیر کا راستہ صاف کیا جائے ۔"

عصمت نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ ایک لمحہ توقف

کے بعد بولا۔ ’’سلیم! میں جانتا ہوں کہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوگی لیکن میں تم سے پوچھے بغیر نہیں جا سکتا............ اب کوئی خبر میرے لیے ناقابل برداشت نہیں۔ بتاؤ تم اپنے گاؤں سے کب روانہ ہوئے اور باقی لوگ کہاں ہیں؟‘‘

سلیم ایک ثانیہ کے لیے خاموشی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ’’تم نے عصمت اور راحت کے سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا اور میں نے غیروں کے سامنے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔ تم عصمت کی ماں کی لاش دیکھ آئے ہو۔ سکھوں سے کچھ بعید نہیں۔ سلیم جو کچھ ہوا ہے، مجھے بتاؤ!‘‘

سلیم نے جواب دیا۔ ’’آپ ایک فرد کی سرگزشت پوچھ رہے ہیں۔ لیکن میں اب ایک فرد نہیں ہوں، ایک قوم ہوں۔ مجھ سے قوم کے متعلق پوچھیے آج قوم کی داستان کا عنوان خاک اور خون ہے اور یہی میری سرگزشت ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اگر میرے پاس کوئی جواب ہوتا تو میں خاموش کیوں رہتا۔‘‘

سلیم کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے، اس نے منہ پھیر کر اپنا چہرہ آستین میں چھپا لیا۔

ڈاکٹر نے سلیم کو کھینچ کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ’’آنسوؤں کو بہنے دو بیٹا! اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہونے دو۔‘‘

’’میرے دل میں صرف آگ ہے۔ میں ایک جلتی ہوئی چتا ہوں۔‘‘ سلیم ڈاکٹر سے الگ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

عصمت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے بتائیے، وہ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ آپ کی دادی، آپ کی ماں، زبیدہ اور خاندان کی دوسری لڑکیاں، آپ کے والد، آپ کے چچا، چچیاں، دادا جان اور یوسف.............؟''

سلیم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عصمت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلیم نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور راکھ کی چھوٹی سی پوٹلی کھول کر عصمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے پاس ان کی ایک نشانی لے آیا ہوں۔ اس راکھ میں ان سب کی زندگی سو رہی ہے، یہ اپنے پاس رکھو!''

وہ تینوں مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر ڈاکٹر نے کہا۔ ''ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا؟''

''میرے اور مجید کے سوا کوئی نہیں!''

''تمہارے والد..........؟''

''وہ بھی چھٹی لے کر آئے تھے، انہیں موٹر سے اترتے ہی شہید کر دیا گیا تھا۔''

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''مجید کہاں ہے؟''

''وہ زخمی تھا۔ میں نے کل اسے اپنے گاؤں کے ایک آدمی کے ساتھ نارووال بھیج دیا ہے۔''

عصمت نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''امینہ تو شاید اپنی سسرال گئی ہوئی تھی؟''

''ہاں وہ وہیں ہے۔''

ڈاکٹر، عصمت اور راحت کے سوالات کے جواب میں سلیم نے مختصراً اپنی

سرگزشت بیان کردی۔

گیارہ بجے کے قریب وہ انہیں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سلیم نے ڈاکٹر کو اپنا گھوڑا دینے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا۔ ''نہیں! تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ میں نارووال تک پیدل جا سکتا ہوں، وہاں میرے ایک دوست کے پاس موٹر ہے، وہ ہمیں لاہور تک پہنچا دے گا!''

رخصت کے وقت ڈاکٹر نے کہا۔ ''بیٹا! ان حالات میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کر سکتا لیکن اپنا خیال رکھنا۔ جس قدر تمہیں قوم عزیز ہے، اسی قدر قوم کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔ اچھا خدا حافظ!''

راحت روتی ہوئی سلیم کے ساتھ لپٹ گئی۔ ''بھائی جان! وعدہ کیجیے کہ آپ جلدی آئیں گے۔''

سلیم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ''راحت میرا کام بہت لمبا ہے۔''

عصمت انتہائی کرب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ وہ اس کائنات سے دور جا چکی تھی۔ جہاں سود و زیاں کا احساس ہوتا ہے۔ سلیم کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''اب میں ایک فرد نہیں ایک قوم ہوں۔''

ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ ''چلو عصمت!''

اپنے باپ کے ساتھ چند قدم اٹھانے کے بعد عصمت نے ایک بار مڑ کر دیکھا۔ سلیم اور اس کی نگاہوں کے درمیان آنسوؤں کا نقاب حائل ہو چکا تھا۔

اچانک سلیم کے دل میں کوئی خیال آیا، اور اس نے جلدی سے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہریئے!'' وہ رک گئے اور سلیم جیب سے ہاتھ نکال کر آگے بڑھا۔

''یہ لیجیے!'' اس نے عصمت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ انگوٹھی ابا جان آپ کے لیے بنوا کر لائے تھے۔ انہوں نے مرتے وقت مجھے دی تھی۔''

عصمت نے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا اشارہ پا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انگوٹھی پکڑ لی۔

سلیم نے دوسرا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہ چند پرانے نوٹ ہیں۔ شاید آپ کو راستے میں ضرورت ہوگی۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''نہیں بیٹا! یہ تم اپنے پاس رکھو۔ مجھے راستے میں سب کچھ مل جائے گا۔''

''اچھا خدا حافظ!'' سلیم یہ کہہ کر مڑا اور دریا کی طرف چل دیا۔ عصمت کچھ دیر اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ ملاح ایک کشتی سے سواریاں اتار کر واپس لوٹنے کو تھے، سلیم نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر کشتی میں سوار ہو گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''چلو بیٹی!''

عصمت روتی ہوئی اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی! حوصلے سے کام لو، وہ ایک مجاہد ہے۔''



مشرقی پنجاب میں وحشت و بربریت کا سیلاب پھیلتا گیا۔ مسلمان اس قیامت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہندو فاشزم کے تدریجی ارتقاء اور تقسیم سے قبل راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکال سینا کی سرگرمیوں کے پیش نظر یہ کہنا غلط ہوگا کہ مسلم عوام کی طرح ان کا اہل الرائے طبقہ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا تھا، لیکن انہوں نے آخری وقت تک دنیا کے سامنے اپنی صلح جوئی اور امن پسندی کا ثبوت دینے کی کوشش کی۔ جب کانگرس کی سرپرستی میں یہ جماعتیں منظم اور مسلح ہو رہی تھیں۔ دردمندانِ قوم کی تمام سرگرمیاں نمائشی بیان بازیوں اور قراردادوں تک محدود تھیں۔ وہ آخری وقت تک اپنے آپ کو یہ فریب دے رہے تھے کہ تقسیم کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد ہندوستان کی حکومت مسلم اقلیت کے متعلق اپنی ذمہ داری محسوس کرے گی۔ یہ ایک خودفریبی تھی اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل کی کشتی میں سوار ہو چکا ہے تو یہ خودفریبی ان کے لیے ایک مجبوری بن گئی۔ ۱۵ اگست کے بعد دشمن کی تلوار ایک نئے انداز میں بے نیام ہوئی اور پنجاب کے لیڈروں نے دیکھا کہ جو ہاتھ مدافعت کے لیے اٹھ سکتے ہیں، وہ خالی ہیں.......... پاکستان کی فوجیں باہر ہیں۔ پاکستان کا اسلحہ ہندوستان میں پڑا ہوا ہے.......... ماؤنٹ بیٹن کی ہندو نوازی اور ریڈکلف کی بددیانتی نے وحشت کے سیلاب کے سامنے کوئی چٹان باقی نہیں چھوڑی۔ پاکستان کی اپنی یہ حالت تھی کہ ابھی تک یہاں نصف کے لگ بھگ غیر مسلم فوج پڑی ہوئی تھی۔

مشرقی پنجاب کے بیشتر لیڈروں کا عوام کے ساتھ اس وقت تک رابطہ تھا جب

تک انہیں اسمبلیوں میں پہنچنے کے لیے ووٹوں کی ضرورت تھی پھر وہ اس وقت عوام کی طرف متوجہ ہوئے جب ملت فروش یونینسٹوں کی وزارت کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بہت کم ایسے لوگ تھے جنہوں نے عوام کے ساتھ رابطہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

۱۵ اگست سے پہلے مشرقی پنجاب کے عوام سکھ اور سیوا سنگھی بلوائیوں کا مقابلہ کر رہے تھے، بعض علاقوں میں غیر مسلم فوج اور پولیس کی جانبداری کے باوجود وہ ہراساں نہ تھے۔ امرتسر میں فوج اور پولیس کے منظم حملوں نے بدحواسی پھیلا دی تھی، تاہم وہ نوجوان جنہوں نے گزشتہ چھ ماہ تک اکال سینا، سیوا سنگھ اور شہریوں کے لباس میں سکھ سپاہیوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن پندرہ اگست کے بعد مشرقی پنجاب کی حکومت، غیر مسلم افواج اور غیر مسلم عوام ایک ہو چکے تھے۔ ایک غیر مسلم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے لے کر ایک چپڑاسی اور کانگرس کے ایک بڑے عہدیدار سے لے کر سیوا سنگھ اور اکال سینا کے ایک معمولی رضاکار تک سب کا ایک ہی پروگرام تھا۔ مسلمانوں کا قتل عام............۱

مشرقی پنجاب کے وہ مسلم لیڈر جو ہر میدان کے لیے قرار دادوں اور بیانوں کے تیر ونشتر کافی سمجھتے تھے، اپنے خاندانوں کے ساتھ مغربی پنجاب پہنچ چکے تھے۔ انہیں مسلم عوام کے لٹے پٹے تباہ حال قافلوں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ عوام کی حالت بھیڑوں کے اس گلے کی طرح تھی جسے اچانک چاروں طرف سے بھیڑیوں نے گھیر لیا ہو۔

شہر اور بستیوں کے جو مسلمان فوج اور پولیس کی گولیوں سے بچ نکلتے، انہیں سڑکوں، پگڈنڈیوں، نہروں اور دریاؤں کے پلوں پر سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے جتھوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمانوں کی ہر آبادی کے بااثر لوگوں، بالخصوص پاکستان کے حامیوں کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارا جاتا۔

پناہ گزینوں کی گاڑیاں پاکستان میں لاشوں کے انبار لے کر پہنچ رہی تھیں۔ مشرقی پنجاب میں ریلوے کے غیر مسلم ملازمین بلوائیوں کو باخبر رکھتے کہ پناہ گزینوں کی فلاں گاڑی فلاں وقت پہنچ رہی ہے اور وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے راستے کے کسی اسٹیشن پر جمع ہو جاتے۔ مردوں کو قتل کر دیا جاتا اور عورتیں چھین لی جاتیں، اگر جتھوں کی آمد میں دیر ہوتی تو راستے کے اسٹیشنوں کے ملازم گاڑیوں کو روک لیتے، جو سکھ، ڈوگرہ اور گورکھا سپاہی ان گاڑیوں کی حفاظت پر متعین ہوتے، خود بھی اس قتل و غارت میں شریک ہو جاتے۔ صرف وہ گاڑیاں پاکستان تک سلامت پہنچتیں جو مسلمان سپاہیوں کی حفاظت میں لائی جاتی تھیں۔

دور افتادہ دیہات کی داستان اس سے بھی زیادہ المناک تھی۔ جب ایک بستی پر حملہ ہوتا، لوگ دوسری بستی کو محفوظ سمجھ کر اس طرف چل پڑتے۔ راستے میں انہیں دوسری بستی کے لوگ بتاتے کہ وہاں بھی حملہ ہو چکا ہے اور وہ ان کے ساتھ کسی اور بستی کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اسی طرح انہیں کبھی شمال، کبھی جنوب، کبھی مشرق اور کبھی مغرب کا رخ کرنا پڑتا اور پھر بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پاکستان کا راستہ کس طرف ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سینکڑوں کربلاؤں میں گھرے

ہوئے تھے۔ چاروں طرف آگ اور خون کا طوفان دیکھ بدحواس انسانوں کی ٹولیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں۔ پھر وہ ایک قافلے کی صورت میں قریب ترین شہروں کا رخ کرتے۔ راستے میں ان پر قدم قدم پر حملے ہوتے اور جب وہ اپنے پیچھے لاشوں کے ڈھیر چھوڑتے ہوئے شہروں میں داخل ہوتے تو وہاں مسلمانوں کے محلوں میں بے گور و کفن لاشوں اور بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا اور ان کے استقبال کے لیے اکال سینا کی کرپانوں کے ساتھ فوج اور پولیس کی سنگینیں بھی ہوتیں۔

جالندھر، ہوشیار پور، فیروز پور اور امرتسر وغیرہ اضلاع کے مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ ان کی اکثریت کی تحصیلیں پاکستان کو مل جائیں گی اور وہ خطرے کے وقت غیر مسلم اکثریت یا ہندوستانی علاقوں سے نکل کر وہاں پناہ لے سکیں گے لیکن ریڈ کلف ایوارڈ ان کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گرا۔

ضلع گورداسپور کی ٹریجڈی صرف وہاں کے مسلمانوں تک محدود نہ تھی، یہ تین اور اضلاع کے مسلمانوں کے لیے بھی موت کا پیغام تھی۔ کانگڑہ، ہوشیار پور اور امرتسر کے اضلاع کی سرحدیں گورداسپور سے ملتی تھیں۔ اگر کشمیر کے متعلق نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے عزائم کی خاطر مسلم اکثریت کا یہ ضلع ہندوستان کو نہ دیا جاتا تو ہوشیار پور کے مسلمان بیاس عبور کر کے یہاں پناہ لے سکتے تھے۔ امرتسر کی نصف مسلم آبادی لاہور کی نسبت یہاں زیادہ آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔ ضلع کانگڑہ اور ریاست چمبہ کے دور افتادہ علاقوں میں بکھری ہوئی مسلم آبادی کو یہ سہارا تھا کہ وہ خطرے کے

وقت گورداسپور کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ جب ضلع گورداسپور وحشت اور بربریت کے طوفان کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تو یہ لوگ ایک ایسے تاریک غار میں بند ہو کر رہ گئے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

پاکستانی اخبارات میں ہر روز اس قسم کی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ ''آج غیر مسلم فوج اور پولیس نے مشرقی پنجاب کے فلاں شہر پر حملہ کیا ہے۔ آج سکھوں کے جتھے اور شہری لباس میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے سپاہی فلاں علاقہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ فلاں سڑک اور فلاں پل پر پناہ گزینوں کے قافلے پر حملے ہوئے ہیں۔ سکھوں نے اتنے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور اتنی عورتیں چھین کے لے گئے ہیں۔ فلاں فلاں اسٹیشنوں پر پناہ گزینوں کی گاڑیوں پر حملے ہوئے ہیں۔ مغربی پنجاب کی حکومت نے احتجاج کیا ہے اور مشرقی پنجاب کے لیڈروں نے تمام الزامات کی تردید کر دی ہے۔ فیروز پور میں قتل عام ہو رہا ہے۔ میانی پٹھاناں کے مسلمان اتنے دنوں سے حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہے ہیں ......میانی پٹھاناں پر ہندوستانی فوج نے ٹینکوں اور مشین گنوں سے حملہ کر دیا ......جالندھر میں فوج نے مسلمانوں کے محلوں پر کرفیو آرڈر لگا دیا تھا فوج اور پولیس کے سپاہی مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دیتے تھے۔ جب وہ باہر نکلتے تھے تو ان پر گولی چلا دی جاتی تھی ......فلاں تاریخ کو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر اپنے مکان خالی کر دیں، ورنہ انہیں گولی مار دی جائے گی ......ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ وہ حفاظت سے پاکستان پہنچا دیے جائیں

گے۔ پھر ریلوے اسٹیشن اور پناہ گزینوں کے کیمپ تک ان پر حملے کیے گئے..........
اتنے مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اتنی عورتیں چھین لی گئیں
..........آج فلاں شہر میں سکھوں نے عورتوں کو ننگا کر کے ان کا جلوس نکالا۔ حکام
اور پولیس تماشا دیکھ رہے تھے..........آج فلاں اسٹیشن اور فلاں کیمپ میں مشرقی
پنجاب کے پناہ گزینوں کی تلاشی لی گئی اور لوگوں کے کپڑے اتار لیے گئے۔ مغربی
پنجاب کے لیڈروں نے پھر احتجاج کیا ہے۔

پناہ گزینوں کو جو راشن ملتا ہے، اس میں زہریلا دیا جاتا ہے۔ فلاں فلاں کیمپ
کے آس پاس تمام کنوؤں کے پانی میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ آج ہندوستان کے وزیر
اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے مشرقی پنجاب کے فلاں فلاں شہر کا دورہ کرنے کے
بعد یہ بیان دیا ہے کہ صورتحال پر قابو پا لیا گیا ہے..........بدامنی، لوٹ مار اور قتل و
غارت کی اجازت نہیں دی جائے گی..........فلاں وزیر اور فلاں لیڈر نے کہا ہے
کہ حالات اعتدال پر ہیں..........آج پٹیل نے فلاں شہر پہنچ کر سکھوں اور
ہندوؤں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پاکستان کو دھمکی دی ہے..........آج مغربی
پنجاب کے فلاں فلاں لیڈروں نے پرزور احتجاج کیا ہے..........''

انسانیت کے دشمنوں کو معلوم تھا کہ پاکستان اب صرف احتجاج یا اپیلوں کے سوا
کچھ کر ہی نہیں سکتا..........وہ مغربی پنجاب کے لیڈروں کی درخواست پر مصالحانہ
گفت گو کے لیے مغربی اور مشرقی پنجاب کے وزراء کی کانفرنس بلاتے، بحث ہوتی،
فسادات کی مذمت ہوتی، ایک مشترکہ بیان جاری کیا جاتا، مغربی پنجاب کے

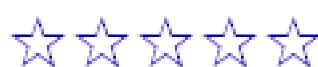
نمائندے مطمئن ہو کر واپس آ جاتے لیکن اگلے دن پھر خبریں آنے لگتیں کہ اب فلاں شہر پر حملہ ہوا ہے۔فلاں جگہ پاکستان کے سرکاری عملہ کی گاڑی روک لی گئی اور فلاں سڑک پر اتنے ہزار آدمیوں کا قافلہ مارا گیا۔

امن کانفرنسیں ہوتی رہیں۔مشترکہ بیانات نکلتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام بھی جاری رہا۔ بھارت کے بیٹوں نے جہاں وحشت اور بربریت کی تاریخ میں ایک نئے اور اچھوتے باب کا اضافہ کیا تھا، وہاں وہ مکروفریب اور جھوٹے پروپیگنڈا کے فن مین بھی دنیا بھر کی اقوام سے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔مشرقی پنجاب میں نہرو کی حکومت کا سفینہ مسلمانوں کے خون میں تیر رہا تھا لیکن وہ مغربی پنجاب میں رائی کو پہاڑ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مغربی پنجاب کے لیڈروں کی سادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ وہ دنیا کے سامنے امن پسندی کا ثبوت دینے کے لیے نا کردہ گناہوں کا بوجھ اپنے سر لینے کے لیے تیار تھے۔یہاں تک کہ جب لاہور میں سکھ اور گورکھا فوج متعین تھی اور وہ کسی روک ٹوک کے بغیر مسلمانوں پر گولیاں چلا رہی تھی، یہ لوگ پریشان حال لوگوں کے سامنے جا کر اپیلیں کرتے رہے کہ تم پر امن رہو.......... مغربی پنجاب کے لیڈر اپنی کاروں میں پٹرول ڈال کر اطلاعات کے منتظر رہتے۔اگر کہیں سے اکا دکا واردات کی خبر آتی تو وہ آدھی رات کے وقت بھی روانہ ہو جاتے۔پھر اگلے دن اخباروں میں ان کے بیان اور تقریریں جلی حروف میں شائع ہوتیں۔وہ اپنے طرزِ عمل سے بھیڑیوں کو انسانیت کا درس دینا چاہتے تھے لیکن امن پسندی اور نیک نیتی کے ان مظاہروں کا اثر فقط

ہندوستان کے اس پروپیگنڈے کو تقویت دینے تک محدود رہا کہ مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مغربی پنجاب کا ردِ عمل ہے۔

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ لدھیانہ، رہتک کرنال، حصار اور گڑ گاؤں کے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کی داستان دوسرے اضلاع کے مسلمانوں کی سرگزشت سے مختلف نہ تھی، ہر شہر اور بستی سے لٹے ہوئے ننگے، بھوکے انسانوں کے قافلے قدم قدم پر لاشوں کے انبار چھوڑتے ہوئے پاکستان کا رخ کر رہے تھے۔ بیوی کو شوہر کا علم نہ تھا۔ بھائی کو بہنوں کا پتہ نہ تھا۔ مائیں دودھ پیتے بچوں کو پھینک کر بھاگ رہی تھیں اور وحشت اور بربریت کا طوفان ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ مشرقی پنجاب ایک جنگل تھا اور اس جنگل کی بادشاہت پر بھیڑیوں کا لشکر قابض ہو چکا تھا۔

لدھیانہ میں قتلِ عام شروع ہوتا تو خبر آ جاتی کہ مشرقی پنجاب کے گورنر نے جالندھر کا دورہ کرنے کے بعد بیان دیا ہے کہ اب صورتحال پر قابو پا لیا گیا۔ گڑ گاؤں اور حصار پر سکھ اور ہندو ریاستوں کے مسلح گروہ حملہ کرتے تو دہلی ریڈیو سے اعلان ہوتا کہ فلاں وزیر نے لدھیانہ کے مسلمانوں کو اطمینان دلایا ہے کہ اب انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ ایک دن گورنر اعلان کرتا کہ مشرقی پنجاب کی یہ پالیسی ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کو زبردستی نکالا جائے اور اگلے دن خبر آ جاتی کہ فلاں فلاں شہر کے مسلمانوں کو اتنے گھنٹے کے اندر اندر اپنے گھر خالی کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔



مشرقی پنجاب کی ریاستیں مسلمانوں کے قتلِ عام میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ کپورتھلہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس لیے وہاں کئی ماہ پیشتر سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے جتھوں کو فوجی ٹریننگ دی جارہی تھی۔ بھرت پور اور الور میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے جتھے میواتی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد رہتک، حصار اور گڑگاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ نابھہ کا حکمران بھی اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق سکھوں اور اکالیوں کو فوج، اسلحہ اور بارود مہیا کر رہا تھا۔

پٹیالہ کا مہاراجہ جو مدت سے مشرقی پنجاب میں قتلِ عام کی سازش میں شریک تھا۔ اس نے پندرہ اگست سے چند ماہ پیشتر ہی اپنے تمام ذرائع پنجاب کی اکال سینا کو مسلح کرنے کے لیے وقف کر دیے تھے۔ پٹیالہ کے سکھوں کو مسلح کرنے اور فوجی تربیت دینے کے بعد درپردہ مشرقی پنجاب کے مختلف اضلاع میں بھیجا جا رہا تھا۔ راجہ کی اپنی فوج کے آدمی شہری لباس میں سکھ جتھوں کی رہنمائی کر رہے تھے تاہم پٹیالہ کی مسلمان رعایا آخری وقت تک خود فریبی میں مبتلا رہے قتلِ عام سے صرف چند دن قبل پٹیالہ شہر میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ میٹنگ بلا کر ان کے لیڈروں سے حلف لیے گئے تھے کہ وہ ہر قیمت پر امن قائم رکھیں گے۔ مسلمانوں کو اور زیادہ اطمینان دلانے کے لیے راجہ نے ہندو مسلم اور سکھ نمائندوں کے سامنے بذاتِ خود یہ اعلان کیا تھا کہ بدامنی پھیلانے والے خواہ کسی مذہب یا قوم سے تعلق رکھتے ہوں، حکومت ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔

حکومت کی فوج اور پولیس بدامنی کی روک تھام کے لیے تیار کھڑی ہے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر امن قائم رکھیں۔

انتہائی مایوسی کی حالت میں انسان خود فریبی کا سہارا لیتا ہے۔ یہی حالت پٹیالہ کے مسلمانوں کی تھی، وہ راجہ کے دامِ فریب میں آ گئے۔ نہ صرف پٹیالہ کے مسلمان بلکہ ریاست کی سرحدوں کے آس پاس کے مسلمان بھی اپنے گھر بار چھوڑ کر پٹیالہ میں پناہ لینے لگے۔ یہاں تک کہ لدھیانہ، کرنال اور پڑوس کے دوسرے شہروں اور بستیوں سے بھی بعض مسلمان پٹیالہ کا رخ کرنے لگے۔ اس کے بعد ایک منظم پروگرام کے ماتحت مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ پہلے مسلح دستوں اور جتھوں نے پٹیالہ کی سرحدوں سے باہر نکل کر حملے شروع کیے۔ مسلمان بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگتے تو سکھ اور ہندو لیڈر انہیں مشورہ دیتے کہ پٹیالہ کی حدود کے اندر امن ہے۔ اب تمہیں صرف وہاں پناہ مل سکے گی۔ پھر انہیں ڈرایا جاتا کہ پاکستان بہت دور ہے۔ تم راستے میں مارے جاؤ گے .... بعض قافلے ان کے جھانسوں میں آ جاتے۔

اس کے بعد راجہ کے سورماؤں نے سرحد کی بستیاں مسلمانوں سے خالی کروائیں اور باہر کی دنیا سے رسل و رسائل کے سلسلے منقطع کر دیے۔ اب شکار چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ قریباً دس دن تک راجہ کی فوج اور پولیس اور سکھوں کے تربیت یافتہ جتھے مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے، راجہ اور اس کے حکام قریباً ہر روز یہ بیان دیتے رہے کہ ریاست میں کسی بدامنی کی اجازت نہیں دی جائے گی ....

مسلمانوں کی جان، مال اور عزت کو کوئی خطرہ نہیں۔

مہاراجہ پٹیالہ نے ایک بھیڑیے کی درندگی کے علاوہ ایک مکڑی کی فراست کا مظاہرہ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے راج پر مکھ کی گدی سنبھالنے کے لیے پٹیل کو کوئی اور آدمی اس سے زیادہ موزوں دکھائی نہ دیا۔

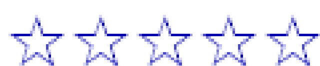
پھر دہلی کی باری آئی۔ یہ تاریخی شہر عدم تشدد کے علمبرداروں کا دارالحکومت تھا۔ یہاں برلا مندر اور بھنگی کالونی میں مہاتما گاندھی اپنے پجاریوں کو اہنسا کا درس دیا کرتے تھے۔ یہاں وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی قیام گاہ تھی۔ جنہوں نے چند ہفتے پیشتر یہ اعلان کیا تھا کہ انتقالِ اختیارات کے بعد باؤنڈری فورس کی موجودگی میں کسی بدامنی کا خطرہ نہیں۔ یہاں ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور سکھشا منتری (وزیر دفاع) سردار بلدیو سنگھ جی اور وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل براجمان تھے۔ حکومت، پریس، پلیٹ فارم اور ریڈیو کے ذریعے بارہا اس بات کا اعلان کر چکی تھی کہ دہلی میں بدامنی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ باہر سے جو سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضاکار جمع ہو رہے تھے، وہ مسلح تھے، اس لیے امن پسند حکومت نے فساد کے خطرے کے پیشِ نظر لوگوں کی تلاشیاں لینی شروع کر دیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کی نہیں .... مسلمانوں کی تلاشیاں، امن پسندوں کی حکومت، سکھوں اور ہندوؤں کی اسٹین گنوں، ٹامی گنوں اور رائفلوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے گھروں میں قلم تراش چاقو، سبزی کاٹنے کی چھریاں اور جلانے کی لکڑیاں تک چھوڑنا خطرناک سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی خطرناک چیزیں بحق سرکار

ضبط کر لی گئیں۔ پھر ''جے ہند'' اور ''ست سری اکال'' کے نعرے بلند ہوے اور آل انڈیا ریڈیو یہ اعلان کرنے لگا کہ آج اکادکا حملے ہوئے، حالات پر قابو پالیا گیا ہے .... آج کرفیو آرڈر لگا دیا گیا ہے .... آج ایک جگہ فساد ہو چلا تھا لیکن پنڈت نہرو نے موقع پر پہنچ کر ہجوم کو منتشر کر دیا .... آج امن کمیٹی نے یہ اعلان کیا ہے .... آج وزیر اعظم پنڈت نہرو نے غیر ملکی اخبار نویسوں اور خبر رساں ایجنسیوں کے متعلق شکایت کی ہے کہ وہ دہلی کی خبروں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔

لال قلعہ کی دیواروں اور جامع مسجد کے نیچے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ وحشت اور بربریت کے ہاتھ انسانیت کا دامن تار تار کرتے رہے۔ گاندھی کے چیلوں کے عہدِ حکومت میں دہلی کی تاریخ کا پہلا باب مسلمانوں کے خون سے لکھا جا رہا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اب بھی وائسرائے تھا۔ پنڈت نہرو اب بھی وزیر اعظم تھا لیکن دہلی پر غنڈوں کی حکومت تھی۔ شاید اس وقت وائسرائے اپنی لاج کی چھت پر کھڑا اپنی آنکھوں سے آگ اور خون کے اس طوفان کا مشاہدہ کر رہا تھا اور ابلیس اس کے کان میں کہہ رہا تھا .... ''میں اس دنیا میں کئی انسانوں کا بھیس بدل کر آیا ہوں۔ میں نے باغ آدم کو کئی بار آگ لگائی ہے۔ میں سمرقند اور بخارا پر چنگیز خان کی صورت میں نازل ہوا تھا۔ میں بغداد میں ہلاکو خان بن کر آیا تھا لیکن تو میرا شاہکار ہے۔''

جب دہلی میں تشدد کے دیوتا کے پجاری اپنا کام ختم کر چکے تو عدم تشدد کا دیوتا بھی وہاں پہنچ گیا۔



پاکستان اب لاکھوں بھوکے، ننگے اور بے سروسامان انسانوں کی جائے پناہ اور ہزاروں زخمیوں کا ہسپتال بن چکا تھا۔ اب مشرقی پنجاب کے شہر اور بستیاں خالی ہو چکی تھیں۔ اب حملہ آوروں کے سامنے کیمپ تھے یا قافلے تھے۔ باؤنڈری فورس توڑی جا چکی تھی اور مسلمانوں کے قتلِ عام کے راستے میں جو رہی سہی رکاوٹیں تھیں، وہ بھی دور ہو چکی تھیں۔ دہلی سے لے کر واہگہ تک پناہ گزینوں کے قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بیشتر قافلوں کی منزل مقصود لاہور تھی۔ لاہور میں روزانہ کئی کئی میل لمبے قافلے روانہ ہو رہے تھے، لاہور کی سڑکوں، لاہور کی گلیوں، لاہور کے اسٹیشن اور لاہور کے کیمپوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

راستے میں کئی کئی راتیں جاگنے اور سینکڑوں میل چلنے کے بعد بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال لوگ واہگہ پہنچ کر پاکستان کی سرحد پر پاؤں رکھتے ہی ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگاتے اور زمین پر لیٹ کر سو جاتے یہ وہ منزل تھی جہاں پہنچنے کے لیے یہ لوگ اپنی زندگی کی تمام پونجی لٹا کر آ رہے تھے۔ حکومت پریشان تھی، حکام بدحواس تھے۔ لاہور میں روزانہ آنے والے پناہ گزینوں کے لیے جگہ نہ تھی لیکن لاہور کے عوام کا ایثار و خلوص یہ ثابت کر رہا تھا کہ لاہور اس بوجھ کو اٹھا سکتا ہے۔ لاہور کے

ریڈیو سے یہ اعلان ہوتا کہ آج اتنے بجے اتنے ہزار اتنے لاکھ مہاجرین کا قافلہ لاہور پہنچ رہا ہے۔ انہیں کھانے کی ضرورت ہے اور عوام اپنی اپنی گلی کوچے اور محلے سے پکا پکایا کھانا جمع کرتے اور چھکڑوں اور تانگوں پر لاد کر کیمپوں میں بھیج دیتے۔

ایثار پیشہ لوگوں کی دوسرے شہروں میں بھی کمی نہ تھی۔ اجتماعی مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے ایک اجتماعی شعور بیدار ہو چکا تھا.......... لیکن جس سیلاب کو ہندوستان کی حکومت پاکستان کی بنیادیں ہلا دینے کے لیے کافی سمجھتی تھی، اسے روکنا معمولی بات نہ تھی.......... اس مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے ایک مضبوط و مستحکم حکومت کے لامحدود ذرائع کی ضرورت تھی اور پاکستان کی حالت اس بچے کی سی تھی جسے پاؤں پر کھڑا ہونے سے پہلے بوجھ اٹھا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا ہو..........

مغربی پنجاب کی حکومت کے سامنے جس قدر بڑا کام تھا، اسی قدر کام چلانے والے ہاتھ ناتجربہ کار تھے اور بعض ہاتھ تو ایسے تھے جنہوں نے گلی ڈنڈا پھینک کر وزارت کے قلمدان سنبھال لیے تھے۔ دفتری نظام کی مشینیں ابھی تک وہی تھیں۔ جو دنوں کا سفر مہینوں میں طے کرتی ہیں۔ بلکہ ایک منظم سکیم کے تحت غیر مسلم ملازموں کے انخلاء کے باعث یہ دفتری نظام بھی درہم برہم ہو چکا تھا۔ مشرقی پنجاب اور باقی ہندوستان سے آنے والے تجربہ کار ملازم جو اس خلا کو پر کر سکتے تھے۔ ان میں سے اکثر قتل کیے جا چکے تھے اور جو پاکستان پہنچ رہے تھے، انہیں اپنا ہوش نہ تھا۔ کسی کی بیوی، کسی کی بہنیں، کسی کے بچے اور کسی کے والدین مارے جا چکے تھے۔ کسی کے عزیز لاپتہ تھے اور وہ ان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

پاکستان کے دشمن اور پاکستان سے زیادہ انسانیت کے دشمن اپنے ترکش کے تمام تیر چلا رہے تھے۔ مشرقی پنجاب میں بے سرو سامان مسلمان اپنی بستیوں اور شہروں سے نکل کر کیمپوں میں جمع ہو رہے تھے۔ اور یہاں سے فوج کے سپاہی انہیں پاکستان لے جا رہے تھے۔ جن قافلوں کی حفاظت کے لیے مسلمان سپاہیوں کے دستے متعین ہوتے وہ آسانی سے پاکستان پہنچ جاتے، حملے ان پر بھی ہوتے، کھلی سڑکوں پر نہیں بلکہ شہروں سے گزرتے ہوئے ان پر سڑک کے آس پاس کے مکانوں سے دستی بم پھینکے جاتے اور گولیاں برسائی جاتیں۔ پھر بھی جس قافلے کے ساتھ پانچ یا دس مسلمان سپاہی ہوتے، اس پر سینکڑوں مسلح بلوائیوں کو کھلے بندوں حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن سڑکوں اور شاہراہوں سے دور دیہاتی علاقوں سے پناہ گزینوں کے جو قافلے ہندوستانی فوج کی حفاظت میں آ رہے تھے۔ ان کا حال اس کے برعکس تھا۔ کسی نہر یا دریا کے کنارے انہیں روک لیا جاتا اور ان سے حفاظت کا معاوضہ طلب کیا جاتا، لوگ بچی کھچی پونجی ان کی نذر کر دیتے۔ پھر علاقہ کی پولیس کا افسر جتھا لے کر پہنچ جاتا۔ جوان لڑکیاں چھین لی جاتیں اور باقی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ بعض لوگ اپنی بہو بیٹیوں کے ساتھ دریا یا نہر میں چھلانگیں لگا دیتے اور حملہ آور کناروں پر کھڑے ہو کر ان پر نشانہ بازی کرتے۔ مشرقی پنجاب کے ہر دریا، ہر ندی اور ہر نالے میں لاشیں تیر رہی تھیں۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے کئی کیمپوں کے آس پاس پانی کے کنوؤں میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ بعض کنوئیں لاشوں سے بھر دیے گئے تھے۔ بارش، کیچڑ اور آس

پاس غلاظت کے ڈھیر لگ جانے سے کیمپوں کی فضا غایت درجہ متعفن ہو چکی پناہ گزینوں کو ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ مسلح سکھوں کے گروہ کیمپوں کے ارد گرد آٹھوں پہر گھیرا ڈالے اس بات کے منتظر رہتے کہ مسلمان فوج کا حفاظتی دستہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو اور وہ حملہ کریں۔

ہندوؤں کی تجارت پیشہ قوم ان حالات میں بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بعض کیمپ ابھی تک ان لوگوں کی دسترس سے بچے ہوئے تھے۔ جو تلاشیاں لے کر مسلمانوں کا رہا سہا سامان چھین لیتے تھے اور ان کیمپوں کے آس پاس بنیوں نے تجارت کی چھوٹی چھوٹی منڈیاں کھول دی تھیں۔ ان منڈیوں میں وہ ایک ایک سیر اناج کے بدلے کئی کئی روپے وصول کر رہے تھے۔ یہاں صرف خوراک کی ہی کی قیمت نہ تھی، پینے کا پانی بھی فروخت ہو رہا تھا۔ دیش بھگت، دیش کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے پانی کا ایک ایک مٹکا سو سو روپے میں فروخت کر رہے تھے۔ صاف پانی بیمار، بچوں اور زخمیوں کے لیے دوا سمجھ کر خریدا جاتا تھا۔ ورنہ زیادہ تر لوگ جوہڑوں میں بارش کے گدلے اور سڑے ہوئے پانی پر گزارہ کر رہے تھے۔ بھوکوں مرتے لوگ درختوں کے پتے اور گھاس کے تنکے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اور مشرقی پنجاب سے جو قافلے مغربی پنجاب کا رخ کر رہے تھے۔ زخمیوں کے علاوہ ہیضے کے مریضوں کو بھی اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ اب پاکستانی پریس اور ریڈیو کی خبروں کا انداز یہ تھا:۔

''فلاں کیمپ سے اتنے ہزار مہاجرین کا قافلہ روانہ ہوا۔ راستے میں اتنے زخمی

اور ہیضے کے مریض مر گئے.........اب مغربی پنجاب کے فلاں فلاں کیمپ میں بھی ہیضے کی وبا پھیل گئی، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ فوراً ٹیکے کروالیں۔آج دہلی کی طرف سے آنے والی فلاں گاڑی لاہور پہنچی، گاڑی میں صرف لاشیں تھیں۔ فلاں افسر اور فلاں لیڈر نے بیان دیا ہے کہ گاڑیوں میں سفر کرنا قطعاً غیر محفوظ ہے۔''

پاکستان ریڈیو صبح شام مہاجرین کے لیے پروگرام نشر کر رہا تھا۔''فلاں فلاں لڑکی کا باپ فلاں کیمپ سے اطلاع دیتا ہے کہ اگر وہ سلامت ہوں تو یہاں پہنچ جائیں، فلاں بانو اور فلاں بیگم کا عزیز اطلاع دیتا ہے کہ وہ زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی اور پشاور وغیرہ سے فلاں فلاں آدمی اطلاع دیتے ہیں کہ اگر مشرقی پنجاب سے ان کے رشتہ دار اور عزیز مغربی پنجاب کے کسی کیمپ میں ہوں تو اطلاع دیں، بہت تشویش ہے۔فلاں صاحب اپنے خاندان کی فلاں فلاں خاتون، فلاں بانو اور فلاں بیگم کا پتہ دریافت کرتے ہیں۔مسمات فلاں اپنے شوہر اور بھائیوں کی متلاشی ہیں۔فلاں فلاں بچے قافلے پر حملے کے دوران میں اپنے والدین سے بچھڑ گئے ہیں، اگر کسی کو علم ہو تو انہیں اطلاع دے۔''

یہ مختصر سے پیغامات ان لاکھوں طویل اور دلخراش داستانوں کے عنوان تھے، جنہیں سننے اور سنانے کی کسی کو ہمت یا فرصت نہ تھی۔

پاکستان ہزاروں مصیبتوں، ہزاروں ناامیدیوں اور ہزاروں پریشانیوں کا سامنا کر رہا تھا، افق پر تاریک آندھیوں کے سوا کچھ نہ تھا.........لیکن اس مہیب طوفان میں بھی روشنی کا ایک مینار اپنی جگہ قائم تھا.........قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی

کے ملاح قائداعظم محمد علی جناح کے الفاظ بجھے ہوئے دلوں مین یقین اور ایمان کی مشعلیں روشن کر رہے تھے.......... پاکستان کو اب کوئی نہیں مٹا سکتا۔ ہم ان تاریکیوں اور طوفانوں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔

اب ہندوستان سے پاکستان کے حصے کی فوج آ رہی تھی۔قوم اپنے سپاہیوں کی پیشانیوں پر نئی زندگی کی ایک جھلک دیکھ رہی تھی۔اب تک بلوچ رجمنٹ کے مٹھی بھر سپاہیوں نے جو کچھ کیا تھا، اس کے پیش نظر قوم پاکستان کی فوج سے بڑی سے بڑی توقع وابستہ کرنے میں حق بجانب تھی۔عوام ان سپاہیوں کے راستے میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔قوم کی بیٹیاں محبت، عقیدت اور تشکر کے آنسوؤں سے ان کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔گنگ زبانوں سے پھر ایک بار ''پاکستان زندہ باد'' کی صدائیں نکل رہی تھیں۔

گاندھی کے امن پسند چیلوں کی تلواروں کی تیزی صرف نہتوں کی گردنوں پر آزمائی جا سکتی تھی۔انہیں اپنے مدمقابل کے ہاتھ میں تلوار دیکھنا گوارا نہ تھا..........

چنانچہ پاکستانی افواج پر بھی پرانے حربے آزمانے کی کوشش کی گئی۔راستے میں جگہ جگہ ان کی اسپیشل گاڑیاں روکی گئیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ تم اپنے ہتھیار ہماری تحویل میں دے دو۔تمہاری حفاظت کے لیے گاڑی کے ساتھ ہندوستانی فوج کا دستہ جائے گا۔لیکن مہاشوں کو معلوم ہوا کہ شہری اور فوجی کی ذہنیت میں بہت فرق ہے۔مسلمان سپاہی جان سے پہلے ہتھیار دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ان کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ ''ہم اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔''

کہیں کہیں سکھوں کے جتھوں نے ان گاڑیوں کو بھی پناہ گزینوں کی گاڑیاں سمجھ کر حملے کیے لیکن ان کا انجام ان چڑی ماروں سے مختلف نہ تھا جو شکار کے شوق میں شیروں کی کچھار کے اندر گھس گئے ہوں۔



راوی کے کنارے پناہ گزینوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ ضلع گورداسپور اور امرتسر کی تحصیل اجنالہ کی بیشتر مسلم آبادی کا رخ اب اس طرف تھا۔ ڈیرہ بابا نانک کے پل سے اوپر اور نیچے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی پڑاؤ تھے۔ بعض مقامات پر کشتیاں لوگوں کو پار پہنچانے میں مصروف تھیں اور بعض جگہ لوگ مویشیوں، چھکڑوں کے تختوں اور پہیوں اور گھاس پھوس کے گٹھوں پر دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس قسم کے سہاروں سے پار پہنچنے والوں کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی۔

[1] شہروں اور بستیوں سے مسلم آبادی کے انخلاء کے بعد سکھوں کی توجہ راستوں، سڑکوں اور راوی کے کنارے پناہ گزینوں کے کیمپوں کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

---

[1] بٹالہ ضلع گورداسپور کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ضلع کے حکام اور بلوائیوں کو خطرہ تھا کہ شہر میں کہیں آس پاس کی بستیوں کے مسلمانوں کا دفاعی مورچہ نہ بن جائے چنانچہ باؤنڈری کمیشن کے اعلان کے ساتھ ہی پولیس نے شہر کو مسلمانوں سے خالی کروانے کی مہم شروع کر دی تھی۔ قرب وجوار کے دیہات کے مسلمان شہر کا رخ کر

رہے تھے۔ اور شہر کے مسلمان سنگینوں کے پہرے میں اپنے گھر بار خالی کر کے کیمپوں میں پناہ لے رہے تھے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کو مسلمان سپاہی فوجی ٹرکوں اور لاریوں میں بٹھا کر امرتسر کے راستے لاہور کی طرف لے گئے۔ اور باقی ہزاروں کی تعداد میں ڈیرہ بابا نانک کا راستہ اختیار کرنے لگے.......... اس کے بعد قادیان، حکومت، فوج اور بلوائیوں کی توجہ کا مرکز بنا۔ احمدیہ جماعت کے لیڈروں کو ہندوستان کی حکومت یہ اطمینان دلا چکی تھی کہ انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ بٹالہ کی صورت حالات سے پریشان ہو کر قادیان کے ارد گرد چند سات میل کے دائرے میں مسلم آبادی اپنے گھر بار خالی کر کے وہاں جمع ہو گئی۔ اس کے بعد آگ کا دائرہ قادیان کے گرد تنگ ہونے لگا اور اس قسم کی خبریں آنے لگیں۔ ''آج احمدیہ جماعت کا وفد فلاں لیڈر سے ملا ہے اور انہوں نے یقین دلایا ہے کہ قادیان کی حفاظت کی جائے گی''.......... ''آج قادیان کے مضافات پر حملے ہوئے۔ اتنے آدمی مارے گئے۔ اتنی عورتیں اغوا کر لی گئیں''.......... ''ہندوستان کے فلاں وزیر نے بیان دیا ہے کہ قادیان کو کوئی خطرہ نہیں''.......... ''آج قادیان میں کرفیو آرڈر لگا دیا گیا''.......... ''قادیان کے باشندوں کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں''.......... ''قادیان کے فلاں فلاں محلوں پر حملے ہوئے ہیں''.......... ''قادیان کی خبروں کا بلیک آؤٹ''.......... ''احمدیہ جماعت کے دو خانگی ہوائی جہازوں کو لاہور اور قادیان کے درمیان پرواز کرنے سے منع کر دیا گیا۔ قادیان کے لوگوں کو زبردستی شہر سے نکالا جا رہا ہے''.......... ''آج چالیس ہزار آدمیوں کا قافلہ پاکستان کی

طرف روانہ ہو گیا'' قادیان اور بٹالہ کے درمیان قافلے پر سکھوں کے حملے .... ''قادیان میں بہت تھوڑے آدمی رہ گئے ہیں'' .... ''پولیس اور ضلع کے حکام لوٹ مار میں حصہ لے رہے ہیں'' .... ''ہندوستان کے فلاں لیڈر اور فلاں وزیر نے بیان دیا ہے کہ قادیان میں بالکل امن ہے'' ....

لوگوں کے سامنے دریا تھا اور پیچھے آگ تھی۔ برسات کی جوانی کے دن گزر چکے تھے۔ لیکن اس سال اگست کے آخری دنوں میں بھی بارش ہو رہی تھی۔ جب تھوڑی دیر کے لیے مطلع صاف ہو جاتا تو لوگ ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ ''اب صرف دو چار دنوں کی بات ہے دریا اتر جائے گا اور ہم پار پہنچ جائیں گے'' لیکن اگلے دن نئی گھٹائیں دیکھ کر وہ کہتے ''دریا نہیں اترے گا۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔'' اندھیری راتوں اور موسلا دھار بارشوں میں ماؤں کے سینوں سے چمٹے ہوئے بچے بلکتے، زخمی اور ہیضہ، ملیریا، نمونیا اور ٹائی فائڈ کے مریض کراہتے۔ اچانک کہیں سے کسی کی چیخیں سنائی دیتیں۔ ''لوگو! میں لٹ گئی۔ میرا بچہ مر گیا'' .... یہ چیخیں ہچکیوں اور آہوں میں تبدیل ہو جاتیں تو کسی اور کونے سے ماتم کی صدائیں آنے لگتیں۔ پھر اچانک یہ شور اٹھتا۔ ''پانی آ گیا۔ یہاں سے بھاگو۔ دریا چڑھ رہا ہے''۔ چاروں طرف کھلبلی مچ جاتی۔ بعض لوگ بدحواسی میں دور ہٹنے کی بجائے دریا کے اندر چلے جاتے اور پانی کا ریلا انہیں بہا کر لے جاتا۔ تاریکی میں لوگ اپنے اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو آوازیں دیتے۔ بارش تھم جاتی تو لوگوں کا شور آہستہ آہستہ کم ہو جاتا۔ لوگ اب بستروں کی بجائے کیچڑ اور پانی میں بیٹھ کر آرام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

دریا کے کنارے سلیم کے لیے ہر دن حشر کا دن اور ہر رات قیامت کی رات تھی، سرپھروں کے گروہ میں سے جس نے آخری دم تک اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا، آٹھ آدمی شہید ہو چکے تھے۔ تین آدمیوں کو سخت بخار کی حالت میں دوسرے کنارے پہنچا دیا گیا تھا اور دو ہیضے کا شکار ہو چکے تھے۔

سلیم کے سامنے کسی خاص مورچے کی حفاظت نہ تھی۔ کیمپ پر حملہ ہوتا تو اس کے ساتھی وہاں لڑتے۔ آس پاس کسی قافلے پر حملے کی اطلاع ملتی تو وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کی حفاظت کے لیے پہنچ جاتے۔ انہوں نے چار بار سکھوں کو پسپا کیا تھا اور پانچویں دفعہ وہ فیصلہ کن حملے کی نیت سے آئے تھے۔ شام کے چار بجے کوئی دو سو سواروں اور قریباً ایک ہزار پیدل سکھوں کا جتھا نصف دائرے میں دریا کی طرف بڑھا۔ حملہ آور کیمپ سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر رک کر رائفلوں سے گولیاں برسانے لگے۔ سلیم کے ساتھی ایک طرف چند چھکڑوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ بارود کی کمی کے پیش نظر سلیم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ صرف ضرورت کے وقت فائر کریں۔ ایک گھنٹہ گولیاں برسانے کے بعد سکھ ''ست سری اکال'' کے نعرے لگاتے ہوئے کیمپ پر ٹوٹ پڑے۔ سوار آگے تھا اور کرپانوں سے مسلح ہجوم ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کیمپ اور ان کے درمیان کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو سلیم نے اپنے ساتھیوں کو فائر کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کوئی ایک منٹ کے اندر اندر تیس چالیس سواروں کو ڈھیر کر دیا لیکن حملہ آور لوٹنے کی بجائے آگے بڑھتے گئے۔ کیمپ سے ایک گروہ سمٹ کر چھکڑوں کے گرد جمع ہونے لگے اور سلیم اور اس کے

ساتھیوں کے لیے فائر کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ مجبوراً چھکڑوں کی آڑ سے نکل کر ان کے اوپر چڑھ کر فائر کرنے لگے۔ سلیم کی چیخ پکار سے بدحواس لوگوں کا یہ ہجوم زمین پر لیٹ گیا۔ اب اس کے ساتھی چھکڑوں پر پڑے ہوئے سازو سامان کی آڑ لے کر فائر کر رہے تھے لیکن اتنی دیر میں حملہ آور کیمپ پر دھاوا بول چکے تھے اور مسلمان لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مدافعت کر رہے تھے بعض نوجوان جو گزشتہ لڑائیوں میں سکھوں کی کرپانیں اور برچھیاں چھین کر مسلح ہو چکے تھے۔ انہوں نے حملہ آوروں کا ایک گروہ آگے لگا رکھا تھا۔ سکھ سواروں کا ایک گروہ چھکڑوں کی طرف بڑھا لیکن گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں منتشر کر دیا۔ پیدل جتھا مسلمانوں کے ساتھ اس طرح گتھم گتھا ہو چکا تھا کہ ان پر فقط اکا دکا فائر کیے جا سکتے تھے۔

عورتیں اور بچے سراسیمہ ہو کر پانی میں اتر گئے تھے۔ جوں جوں مرد دریا کی طرف ہٹ رہے تھے، عورتیں دریا میں گہرے پانی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سکھوں کے ایک زبردست حملے نے چند آدمیوں کو دریا کے اندر دھکیل دیا۔ اور عورتیں چیختی چلاتی آگے بڑھ کر دریا کے تیز دھارے میں چلی گئیں۔ بعض مرد اب مقابلہ کرنے کی بجائے انہیں ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں بھی بیشتر ایسے تھے جو تیرنا نہیں جانتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب رہے تھے۔ جو لوگ چھکڑوں کے اردگرد زمین پر لیٹے ہوئے تھے وہ کیمپ کے باقی لوگوں سے کٹ چکے تھے۔ بندوقوں سے مسلح آدمیوں کی گولیاں حملہ آوروں کو قریب آنے سے روک رہی تھیں۔ سکھوں کی ایک مسلح ٹولی ایک طرف کوئی سو گز دور زمین

پر لیٹ کران پر فائر کرنے لگی۔

حملہ آوروں کے جتھے کا لیڈر ایک مشکی گھوڑے پر سوار جنگ کے میدان سے کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور کھڑا تھا، اس کے دائیں اور بائیں دو اور آدمی کھڑے تھے۔ برچھیوں اور تلواروں سے مسلح مسلمانوں کا گروہ سکھوں کی ایک ٹولی کو دھکیلتا ہوا جتھیدار سے کوئی پچاس گز کے فاصلے تک لے گیا۔ جتھیدار گھوڑا آگے بھگا کر چلایا۔ ''بے غیرتو! تمہیں پیچھے ہٹتے شرم نہیں آتی۔'' سکھوں نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا اور تھوڑی دیر میں سواروں کی ایک ٹولی میدان سے نکل کر مسلمانوں کے عقب میں پہنچ گئی۔ مسلمان اپنے پیچھے کئی لاشیں چھوڑنے کے بعد ایک جگہ سے سواروں کا گھیرا توڑ کر دوبارہ اپنے رہے سہے ساتھیوں سے آملے۔

سلیم کے اکثر ساتھی اب اپنی اپنی بندوقوں کا آخری راؤنڈ چلا چکے تھے۔ سلیم نے اپنا آخری راؤنڈ چلانے کے بعد ٹامی گن اپنے پاس لیٹے ہوئے آدمی کے سپرد کی اور تھیلے سے پستول نکال کر چھکڑے سے اترا اور زمین پر رینگتا ہوا دوسرے چھکڑے پر داؤد کے پاس پہنچا۔ داؤد کے قریب لیٹا ہوا آدمی سر میں گولی لگنے سے شہید ہو چکا تھا اور اس کے اردگرد سامان کی پیٹیاں اور بوریاں گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھیں۔ داؤد کی پیشانی پر خون کی لکیر دیکھ کر سلیم نے کہا ''داؤد تم زخمی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''گولی میری کھوپڑی کے اوپر سے پھسل گئی ہے۔ مجھے معمولی خراش آئی ہے۔''

سلیم نے کہا۔ ''داؤد! میری بارود ختم ہو چکی ہے، صرف پستول کی چند گولیاں

ہیں۔‘‘

داؤد نے کہا۔ ’’میرے پاس شاید دو راؤنڈ اور ہوں گے۔‘‘

سلیم نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دستی بم نکالتے ہوئے کہا۔ ’’یہ لو!‘‘

ایک گولی آئی اور سلیم کے کان سے مس کرتی ہوئی گزر گئی۔

داؤد چلایا۔ ’’اپنا سر نیچے کر لو!‘‘

سلیم نے سر نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ لو داؤد جلدی کرو!‘‘

داؤد نے اس کے ہاتھ سے دستی بم لے لیا اور سلیم چھکڑے سے اتر کر نیچے لیتے ہوئے آدمیوں کے درمیان چلا گیا۔

’’تم کہاں جا رہے ہو؟‘‘ داؤد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

سلیم نے جواب دیا۔ ’’باتوں کا وقت نہیں‘‘۔

سلیم نے رینگتے ہوئے ایک آدمی کے پاس پہنچ کر اس کے سر سے پگڑی اتروائی اور جلدی سے اپنا سر اور نصف چہرے کے گرد لپیٹ کر سکھوں کی طرح ڈھاٹا باندھ لیا۔ پھر اپنی شلوار کے پائنچے گھٹنوں سے اوپر چڑھانے کے بعد وہ اٹھا اور پوری رفتار کے ساتھ بھاگتا ہوا دست بدست لڑائی کرنے والے ہجوم میں جا گھسا۔ ایک طرف سواروں کی ٹولی برچھیوں اور نیزوں سے مسلمانوں کو دریا کی طرف دھکیل رہی تھی۔ سلیم نے ایک زخمی سکھ کی برچھی اٹھائی اور ایک سوار کے عقب میں پہنچ گیا۔ جب سکھ سوار ایک گرے ہوئے مسلمان پر جھک کر برچھی کا وار کر رہا تھا، سلیم نے آگے بڑھ کر پوری قوت کے ساتھ اس کی کمر میں برچھی ماری اور اسے دھکیل کر برچھی سمیت

ایک طرف لڑھکا دیا۔ سوار کی برچھی نیچے پڑے ہوئے مسلمان کو لگنے کی بجائے ریت میں دھنس کر رہ گئی۔ سلیم نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بدحواس گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کود کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک اور سکھ سوار ایک مسلمان پر نیزے سے حملہ کر رہا تھا اور وہ اپنی لاٹھی سے اس کے وار روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم نے جلدی سے ریت میں دھنسی ہوئی برچھی نکالی اور گھوڑے کو آگے بڑھا کر سکھ کی پسلی میں گھونپ دی۔ اس کے بعد اس نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر گھوڑے کی باگ موڑ کر ایڑ لگائی اور میدان سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اس طرف تھا جہاں جتھیدار پنتھ کا جھنڈا لیے کھڑا تھا۔ سلیم بھاگتے ہوئے گھوڑے کی گردن کے ساتھ سر لگائے کبھی زین سے ایک طرف اور کبھی دوسری طرف اس انداز سے لڑھک رہا تھا کہ جن سکھوں نے اسے دیکھا بھی وہ یہی سمجھے کہ ان کا کوئی زخمی ساتھی ہے۔

گھوڑے کو دور سے دیکھ کر جتھیدار نے اپنے ساتھیوں سے کہا........... ''یہ تو مہاراج سنگھ کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے.......... ارے وہ زخمی ہے گھوڑا روکو!''

جتھیدار کے دو ساتھی آگے بڑھ کر گھوڑے کو چمکارنے لگے لیکن سلیم ان سے کترا کر آگے نکل گیا اور سیدھا جتھیدار کی طرف بڑھا۔ جتھیدار نے پریشان ہو کر اپنا گھوڑا ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی لیکن سلیم نے اچانک اپنا سر اٹھایا ایک ہاتھ سے باگ موڑ کر گھوڑے کا رخ دوبارہ جتھیدار کی طرف کیا اور دوسرے ہاتھ سے برچھی اس کی طرف سیدھی کر دی۔ جتھیدار نے جھنڈا پھینک کر اپنا پستول نکالا لیکن

اتنی دیر میں سلیم کی برچھی اس کے سینے کے آر پار ہو چکی تھی۔ بدحواس گھوڑا جتھیدار کی تین من کی لاش لے کر ایک طرف بھاگا، اس کا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا ہوا تھا اور سر زمین سے رگڑ کھا رہا تھا۔ سلیم نے اوپر سے چکر کاٹتے ہوئے اس کے گھوڑے کو گھیرا اور اس کا رخ ہجوم کی طرف پھیر دیا۔ جتھیدار کا ایک ساتھی گرا ہوا جھنڈا اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم نے گھوڑا موڑ کر پستول نکالا اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ دوسرا آدمی پوری رفتار سے اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگتا ہوا یہ کہہ رہا تھا۔ ''جتھے دار مارا گیا۔ جتھے دار مارا گیا۔'' سکھ جن میں سے بعض اب چیختی چلاتی لڑکیوں کو اٹھا کر گھوڑوں پر ڈال رہے تھے، اس کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب بدحواس گھوڑا بھاری بھر کم لاش کو گھسیٹتا ہوا ہجوم کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ پانی کی ایک کھائی پر سے کودتے ہوئے رکاب ٹوٹ گئی اور کیچڑ سے لت پت لاش زمین پر آ رہی۔

''جتھیدار مارا گیا.........جتھیدار مارا گیا۔'' آن کی آن میں یہ خبر میدان میں ہر سکھ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی.........سلیم گھوڑا بھگاتا ہوا سکھوں کے ہجوم کے قریب سے گزرا تو جتھیدار کا ساتھی چلایا۔ ''وہ دیکھو، وہ جا رہا ہے۔ جتھیدار کو اس نے مارا ہے۔'' لیکن ہر سکھ اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ جتھیدار کا ساتھی محسوس کر رہا تھا کہ اس ہنگامے میں اس کی آواز صرف اس کے اپنے کانوں کو متاثر کر رہی ہے۔

شام ہو رہی تھی مسلمانوں نے اخری بار پوری قوت سے حملہ کیا اور سکھوں کو پیچھے ہٹانے لگے۔ بعض سکھ جو جتھیدار کی موت سے بہت زیادہ بدحواس تھے، میدان سے

ایک طرف نکل کھڑے ہو گئے۔ رائفلوں سے مسلح سکھوں نے مدمقابل سے اپنی گولیوں کا جواب نہ پا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

سلیم اوپر سے چکر لگا کر سرپٹ گھوڑے پر بلند آواز میں یہ کہتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا۔ ''جتھے دار مارا گیا۔ پاکستانی فوج آ گئی .... بلوچ رجمنٹ گھیرا ڈال رہی ہے۔''

اپنے باقی ساتھیوں کو عین فتح کے وقت پیچھے ہٹتا دیکھ کر یہ گروہ پہلے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ اب لیڈر کی موت کے ساتھ پاکستانی فوج کی آمد کی خبر سنی تو ان میں سے بعض آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کھسکنے لگے۔ سکھوں کو پسپا کرنے کے لیے اب آخری ریلے کی ضرورت تھی۔ اچانک ایک طرف سے گھوڑوں کی ٹاپ اور اس کے ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی پندرہ بیس آدمیوں کی ٹولی گھوڑوں پر نمودار ہوئی۔ سوار مار دھاڑ کرتے ہوئے میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچے، ان کے پیچھے ایک پیدل گروہ نمودار ہوا۔

سلیم نے اپنا ڈھاٹا اتار کر پھینک دیا اور گھوڑے سے چھلانگ لگاتے ہوئے چھکڑوں کے ارد گرد لیٹے ہوئے آدمیوں کے پاس پہنچ کر کہا۔ ''دشمن بھاگ رہا ہے .... آج پھر خدا نے تمہاری سن لی ہے۔ حملہ کر دو!''

وہ لوگ جنہیں تھوڑی دیر پہلے سو فیصدی اپنی موت کا یقین تھا۔ ایک نئی امید، نئے عزم اور نئی قوت کے ساتھ میدان میں پڑے ہوئے زخمیوں کے ہتھیار اٹھا کر حملے کر رہے تھے .... میدان خالی ہو گیا۔ سواروں کا دستہ ایک میل تک سکھوں کا

پیچھا کرنے کے بعد واپس آیا تو سلیم کو معلوم ہوا کہ اس نئے گروہ کا لیڈر امیر علی ہے۔

امیر علی نے سلیم کو دیکھتے ہی کہا۔ ''بھائی! ہمیں بزدلی کا طعنہ نہ دینا۔ ہم نے تین حملے پسپا کیے اب ہماری بارود ختم ہو چکی ہے۔ میں ایک گوردوارے سے آٹھ سو کارتوس اور دو رائفلیں چھین کر لایا تھا لیکن اب میرے پاس صرف دو کارتوس رہ گئے ہیں۔''

''عورتوں کا کیا حشر ہوا؟''

''وہ بھی آ گئی ہیں۔ ہم نے گولیوں کی آواز سن کر انہیں چند آدمیوں کے ساتھ تھوڑی دور پیچھے دریا کے کنارے بٹھا دیا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کتنی بارود ہے؟''

سلیم نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر پستول کی چند گولیاں نکالتے ہوے کہا۔ ''صرف یہ! میرے باقی ساتھیوں کی بارود بھی قریباً ختم ہو چکی ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''میرے پاس شاید اسٹین گن کی کچھ گولیاں ہیں۔''

ایک اور آدمی نے کہا۔ ''میرے پاس چار گولیاں باقی ہیں۔''

باقی سب خالی ہاتھ تھے۔ امیر علی نے مایوس ہو کر کہا۔ ''وہ اب زیادہ تیاری کے ساتھ واپس آئیں گے۔ ہمیں ہر قیمت پر بارود حاصل کرنا پڑے گی۔''

سلیم نے کہا۔ ''امیر علی! اگر یہاں ہمارا مشن ختم نہیں ہو گیا تو خدا نئے وسائل پیدا کر دے گا۔''



آدھی رات تک کیمپ کے لوگ ریت کے گڑھے کھود کھود کر شہیدوں کو دفن کرتے رہے۔ شہیدوں کی تعداد سات سو سے اوپر تھی اور زخمیوں کی تعداد اس سے قریباً ڈیڑھ گنا زیادہ تھی۔ دریا میں کود کر ڈوبنے والی عورتوں اور لڑکیوں اور بچوں کی تعداد کا اندازہ پانچ سو کے لگ بھگ تھا اور قریباً ڈھائی سو آدمی انہیں بچانے کی کوشش میں ڈوب چکے تھے۔ سواروں کی ایک ٹولی پندرہ کے قریب لڑکیاں چھین کر اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

حملوں کے دوران میں ملاحوں کو دوسروں سے زیادہ اپنی جانوں اور اپنی کشتیوں کی فکر ہوئی۔ چند دن قبل سکھوں نے کیمپ پر اس وقت حملہ کیا تھا جبکہ ملاح اپنی کشتیوں پر سواریاں لاد چکے تھے۔ دو کشتیاں جتھے کی آمد سے پہلے پہلے دوسرے کنارے کی طرف نکل گئیں لیکن تیسری کشتی پر ملاحوں کی چیخ پکار کے باوجود بدحواس انسانوں کا ایک ہجوم ٹوٹ پڑا۔ ہر آدمی اپنے اپنے گھر کی عورتوں کو کشتی میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچے، عورتیں، مریض اور زخمی جو پہلے سوار ہوئے تھے، کشتی پر نئے حملہ آوروں کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ کشتی کمر کے برابر پانی میں رکی ہوئی تھی اور بوجھ سے اس کے کنارے پانی کی سطح کو چھو رہے تھے۔ جو لوگ نیچے کھڑے تھے۔ وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر کشتی کے ساتھ چمٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی کشتی کے سواروں کے ہاتھ، کوئی ان کے گریبان اور کوئی ان کے پاؤں کے ساتھ لٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے کو سمجھا رہا تھا لیکن سب کہنے والے تھے، سننے والا کوئی نہ تھا۔

کشتی کے دو ملاح لوگوں کو دھکے دے دے کر پیچھے ہٹا رہے تھے۔ کسی نے بدحواسی کی حالت میں ایک ملاح کا گھٹنا پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ ملاح جھک کر اس کی کلائیاں مروڑ رہا تھا کہ دوسرا آدمی ملاح کے بازو کے ساتھ چمٹ گیا اور ملاح سر کے بل پانی میں آ رہا۔ اس افراتفری میں بعض آدمی کشتی کو دھکیلتے ہوئے گہرے پانی میں لے گئے۔ ایک لہر آئی اور کشتی کناروں تک پانی سے بھر گئی اور دوسری لہر کے ساتھ پانی میں ڈوب گئی۔

اس حادثہ کے بعد ملاح کشتیاں کمر کے برابر پانی سے آگے نہیں لاتے تھے۔ آج بھی وہ جتھے کی آمد کے آثار دیکھتے ہی اپنی کشتیاں واپس لے گئے تھے اور حملے کی شدت کے پیش نظر انہیں امید نہ تھی کہ وہ دوبارہ واپس آ کر کسی زندہ انسان کو دیکھیں گے۔ دو ملاحوں نے اپنی کشتیاں چند میل دور ایک اور کیمپ کے پاس لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب سکھ پسپا ہوئے تو وہ اپنے دلوں میں ایک نیا ولولہ محسوس کر رہے تھے۔ فقیر دین نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور باقی ملاح اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنی اپنی کشتیوں پر دوسرے کنارے کا رخ کر رہے تھے۔

جب سلیم زخمیوں، عورتوں اور بچوں کو کشتیوں پر سوار کرانے میں مصروف تھا، امیر علی نے داؤد کا ہاتھ پکڑا اور اسے چند قدم ایک طرف لے جا کر سوال کیا۔ ’’داؤد اب کیا ہو گا؟‘‘

’’یہاں حملوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے‘‘۔ داؤد نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''لیکن بارود کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ اب ہم نے کئی دنوں سے سوچنا ترک کر دیا ہے۔ صرف سلیم سوچا کرتا ہے اور اب شاید وہ بھی سوچنا چھوڑ دے۔''

امیر علی نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ تمہارے پاس اسٹین گن کی کچھ گولیاں ہیں۔''

''ہاں!''

''وہ مجھے دے دو۔ مجھے ایک جگہ سے اسلحہ ملنے کی امید ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ ہمیں رائفل کی چند گولیاں بھی مل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک دستی بم بھی ہے، تم کب جانا چاہتے ہو؟''

''ابھی!''

''گھوڑوں پر؟''

''ہاں!''

''چلو!''

امیر علی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''سلیم سے اجازت لینے کی اجازت ہوگی؟''

''اسے مت بتاؤ، وہ ہمیشہ خطرے میں اپنے ساتھیوں سے آگے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''آؤ!''



علی الصباح نماز کے بعد سلیم نے داؤد کو غیر حاضر پا کر اس کے متعلق اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ایک آدمی نے اسے بتایا کہ میں نے رات کے وقت داؤد اور امیر علی کو گھوڑوں پر سوار ہو کر کیمپ سے نکلتے دیکھا ہے۔ ایک اور ساتھی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ''میرے پاس رائفل کی جو گولیاں بچی ہوئی تھیں، وہ داؤد نے مجھ سے لے کر اپنے ساتھی کو دے دی تھیں۔ میں نے پوچھا تم کہاں جا رہے ہو؟ لیکن اس نے یہی جواب دیا کہ میں واپس آ کر بتاؤں گا!''

سلیم نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہے، وہ کہیں سے بارود حاصل کرنے گئے ہیں۔''

ایک آدمی نے کہا۔ ''اگر کہیں سے تھوڑی بہت لے بھی آئے تو ہم ایک یا دو حملوں کا مقابلہ کر سکیں گے .... اس شکست کے بعد ان کا تازہ حملہ یقیناً زیادہ شدید ہو گا، ہمیں ان لوگوں کی فکر کرنی چاہیے۔ جتنے آدمیوں کو کشتیاں روزانہ نکالتی ہیں، اس سے زیادہ نئے آدمی آ جاتے ہیں۔ بیماری زور پکڑ رہی ہے، راشن ختم ہو رہا ہے۔ اگر چند دن تک حملہ نہ بھی ہوا تو بھی جو بیماری سے بچ جائیں گے، وہ بھوک سے مر جائیں گے۔''

سلیم نے کہا۔ ''پرسوں پاکستانی سپاہیوں کی حفاظت میں ہزاروں آدمیوں کا قافلہ پل پر سے گزر گیا، اوپر والے کیمپ کے لوگ بھی اس میں شامل ہو کر نکل گئے لیکن ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکی۔ اب ہمیں مسلمان سپاہیوں کی حفاظت میں آنے والے کسی نئے قافلے کا انتظار کرنا پڑے گا .... جونہی پل محفوظ ہو، وہاں پہنچ جانا

چاہیے .... غلام علی! تم ابھی صادق کے ساتھ روانہ ہو جانا۔ دیکھو اگر اپنے گھوڑوں میں سے کوئی آس پاس چر رہا ہے تو لے جاؤ۔ ورنہ امیر علی کے آدمیوں سے دو گھوڑے لے لو۔ دوسرا کنارہ محفوظ ہے۔ اس لیے تم یہیں سے دریا عبور کر کے پل کی دوسری طرف جاؤ اور ہمیں وہاں کے حالات سے باخبر رکھو۔ اگر مسلمان فوج کا کوئی افسر ملے تو اسے بتاؤ کہ اس پل پر مستقل پہرے کی ضرورت ہے۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ''ادھر دیکھیے، شاید وہ آرہے ہیں!''

سلیم کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ اسے تین فرلانگ کے فاصلے پر دھان کے کھیتوں میں ایک سوار دکھائی دیا۔ گھوڑا معمولی رفتار سے آرہا تھا۔ سلیم نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا سر جھکا لیا۔ سوار نے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا، لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے .... یہ امیر علی تھا اور اس کی گود میں ایک لاش تھی۔ داؤد کی لاش.........!''

لوگوں نے لاش کو اتار کر زمین پر ڈال دیا۔ امیر علی نیم خوابی کی حالت میں گھوڑے سے اتر کر ایک لمحہ زین کے ساتھ سینہ لگائے کھڑا رہا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''امیر علی! امیر علی!!'' امیر علی کچھ کہے بغیر دو قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اس کا قمیض خون میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی دھاڑیں مارتی ہوئی آگے بڑھی اور امیر علی کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

سلیم نے داؤد کی طرف دیکھا۔اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا۔

انا اللہ و انا الیہ راجعون

کہہ کر وہ امیر علی کی طرف متوجہ ہوا اور ہجوم کو ادھر ادھر ہٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔اس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد سلیم نے جلدی سے اس کی قمیض اٹھا کر دیکھی ۔اس کے پیٹ اور سینے میں گولیوں کے تین زخم تھے۔سلیم نے دوبارہ نبض پر ہاتھ رکھا۔پھر اس کی آنکھیں کھول کر دیکھیں اور ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔''اس کا یہاں تک پہنچنا بھی ایک معجزہ تھا۔''

جب آدمی دریا کے کنارے سے ذرا دور ہٹ کر قبریں کھود رہے تھے،امیر علی کی نوجوان بیوی سب کو یہ سمجھا رہی تھی۔''وہ نہیں مرا،وہ زندہ ہے۔تم سب پاگل ہو گئے ہو۔خدا کے لیے!اسے اچھی طرح دیکھو۔تمہیں کیا ہو گیا۔تم زندوں کو دفن کر رہے ہو۔''وہ سلیم کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی اپنے شوہر کی لاش کے پاس لے گئی۔

''بھائی!تم اچھی طرح دیکھو، یہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔یہ زندہ ہے،میرا شوہر زندہ ہے۔اسے کوئی نہیں مار سکتا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو میری بہن!وہ زندہ ہے۔شہید مرا نہیں کرتے۔''

جب داؤد اور امیر علی کو دفن کر دیا گیا تو سلیم کچھ دیر بے حس و حرکت ان کی قبروں کے پاس کھڑا رہا۔کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''داؤد آپ کا بھائی تھا؟''

''داؤد اور امیر علی دونوں میرے بھائی تھے۔''سلیم یہ کہہ کر قبروں کے پاس ایک

جھاڑی کے نیچے نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔

مصیبتوں اور مایوسیوں کے مقابلے میں مدافعت کی وہ قوت جسے اس نے چند دنوں سے گرتی ہوئی صحت کے باوجود قائم رکھا تھا۔ اب دم توڑ رہی تھی۔ گزشتہ چار دنوں سے اسے ہلکا ہلکا بخار رہتا تھا۔ تاہم اجتماعی احساس کی شدت نے اسے جسمانی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا۔ اگر کشتیاں کنارے پر آتیں تو لوگ پار پہنچنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور افراتفری مچ جاتی .... سلیم کو ہجوم پر قابو پانے کے لیے کئی کئی گھنٹے کنارے پر کھڑا رہنا پڑتا۔ وہاں سے اطمینان ہوتا تو وہ مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری کرتا۔ عشا کی نماز کے بعد آدھی رات تک وہ کیمپ میں چکر لگاتا۔ پہریداروں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتا۔ کھانے کے وقت بھی اپنا پیٹ بھرنے کی بجائے اس کی یہ خواہش ہوتی کہ کوئی بھوکا نہ رہے۔ پھر اسے جب یہ اطلاع ملتی کہ آس پاس کے کسی کیمپ یا قافلے پر حملہ ہوتا تو وہ مسلح ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ جاتا۔ داؤد اسے اکثر کہا کرتا تھا۔ ''سلیم! تم آرام کرو، تمہاری صحت گر رہی ہے، تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے۔'' لیکن وہ جواب دیتا۔ ''بھائی! میں ٹھیک ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔''

اور آج وہ داؤد کی قبر کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کاش! آج داؤد مجھے یہ کہتا۔ ''سلیم! تم لیٹ جاؤ............ اسے شدت کے ساتھ اپنی تنہائی اور بےبسی کا احساس ہو رہا تھا۔''

ایک شخص کھانا لے کر آیا لیکن اس نے کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں۔'' اور زمین پر

لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو رہا تھا۔ نیند کی حالت میں وہ وقت اور بعد کے پردوں کو اٹھاتا ہوا شاہراہ حیات کے اس کنارے پہنچ چکا تھا جہاں ماضی کی مسکراہٹیں دفن تھیں .... وہ داؤد، مجید، جلال اور بشیر کے ساتھ گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں کھیل رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ درختوں میں پرندوں کے گھونسلے تلاش کر رہا تھا۔ وہ چمکتے ہوئے پروں والے موروں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ رنگا رنگ کے پھولوں کے گلدستے بنا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے خاندان کے بچوں کے ساتھ جھولا جھول رہا تھا .... گھر کی عورتوں کے درمیان بیٹھا انہیں کہانیاں سنا رہا تھا۔ آخر یہ منظر قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح روپوش ہوتے گئے۔ پھر وہ چچا اسماعیل کے قہقہے سننے لگا۔ یہ خوش گوار قہقہے بلند اور مہیب ہوتے گئے .... اسماعیل کے اردگرد اچانک آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ شعلے بلند ہوتے گئے۔ اب اس کے اردگرد سینکڑوں مرد، عورتیں اور بچے قہقہے لگا رہے تھے۔ آگ کے شعلوں نے انہیں چھپا لیا لیکن قہقہے اسی طرح سنائی دیتے رہے۔

"سلیم! سلیم!!" کسی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ سلیم نے آنکھیں کھولیں اور اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا .... چند مرد اور عورتیں اس کے گرد جمع تھے۔ ایک شخص نے پانی کا کٹورا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیجیے! آپ پانی مانگ رہے تھے۔"

سلیم کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کٹورا لے کر منہ سے لگا لیا اور پانی پینے کے بعد دوبارہ زمین پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے خواب میں پانی مانگا ہوگا!"

ایک سفید ریش آدمی نے سلیم کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! تمہیں بخار ہے، چلو! میں تمہیں اپنے گھوڑے پر لے چلتا ہوں۔'' یہ امیر علی کا چچا تھا۔

سلیم نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں لے چلتے ہیں آپ مجھے؟''

امیر علی کے چچا نے جواب دیا۔ ''ہم پل کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ کا آدمی بلوچ رجمنٹ کے چار سپاہی لے کر پہنچ گیا ہے۔''

اپنے اردگرد جمع ہونے والے آدمیوں میں غلام علی اور اس کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے ایک حوالدار کو دیکھ کر سلیم دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

غلام علی نے کہا۔ ''ہمیں پل پر پہنچتے ہی یہ مل گئے تھے۔''

حوالدار نے کہا۔ ''ہمارے کپتان صاحب نے حکم دیا ہے کہ کیمپ کے لوگ شام سے پہلے پل پر پہنچ جائیں۔ وہ ایک قافلہ لینے کے لیے چلے گئے ہیں اور انہوں نے ہمیں آپ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ لوگ جلدی چلیں۔''

ایک گھنٹے کے بعد قریباً دس ہزار انسانوں کا قافلہ پل کی طرف کوچ کر رہا تھا لیکن ڈیڑھ ہزار کے قریب بیمار، بوڑھے، اپاہج اور زخمی جن کا پیدل چل کر پل تک پہنچنا دشوار تھا، مایوسی سے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ بعض کے عزیز انہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے لیکن سلیم نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ کل صبح تک پار پہنچا دیے جائیں گے، آپ لوگ پل عبور کرنے کے بعد انہیں وہاں سے لے جائیں۔ سلیم کے مشورے پر اس کے ساتھیوں نے بعض عورتوں اور بچوں کو سواری کے لیے اپنے گھوڑے دے دیئے۔

بہت سے نوجوان سلیم کو بخار کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ عورتیں بھی اپنے محسن کو ساتھ لے جانے پر مصر تھیں لیکن سلیم اپنی ضد پر قائم رہا۔ اپیلوں اور التجاؤں کے جواب میں اس کا پہلا اور آخری جواب یہی تھا کہ ''جب تک یہ کیمپ خالی نہیں ہوتا، میں یہیں رہوں گا۔''

غلام علی، صادق اور چار اور آدمی جنھوں نے مرتے دم تک سلیم کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا، وہیں رہے۔ رخصت سے پہلے حوالدار نے سلیم سے کہا۔ ''میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے لیکن اب آپ ہمارے ساتھ چلیے! میں کپتان کی اجازت کے بغیر آپ کی جگہ اپنے دو آدمی چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔''

سلیم نے کہا۔ ''آپ کے آدمیوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ اگر آپ ہمارے لیے کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو ہمیں بندوق کے چند راؤنڈ دے دیجیے۔''

حوالدار نے کچھ کہے بغیر اپنی پیٹی سے چند راؤنڈ نکال کر سلیم کو دے دیئے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی اور ساٹھ ستر گولیاں جمع کر کے سلیم کو پیش کر دیں۔

حوالدار نے کہا۔ ''یہ بارود بہت تھوڑی ہے۔ آپ جلد از جلد باقی آدمیوں کو پار پہنچانے کی کوشش کریں۔ اگر مجھے اجازت ملی تو میں خود یہاں آنے کی کوشش کروں گا۔''

سلیم نے کہا۔ ''میں آپ کو ایک اور تکلیف دینا چاہتا ہوں۔''

حوالدار نے کہا۔ ''میں ایک مسلمان ہوں اور جو کچھ آپ نے ان لوگوں کے لیے کیا ہے اس کے بعد آپ مجھے حکم دے سکتے ہیں۔''

سلیم نے کہا۔ ''آپ ہماری فالتو بندوقیں لے جائیے! اب شاید ہم ان کی حفاظت نہ کر سکیں۔ ہم نے ان میں سے ایک ایک کے بدلے کئی کئی جانیں دی ہیں۔ انہیں قوم کی امانت سمجھیے۔ قوم کو اب ان چیزوں سے زیادہ کسی شے کی ضرورت نہیں۔''

جب قافلہ روانہ ہو گیا تو سلیم نے آگے بڑھ کر دریا کے کنارے ملاحوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''بھائیو! اب تمہاری آخری دوڑ ہے۔ میں جانتا ہوں تم تھک گئے ہو.........ہم سب تھک گئے ہیں۔'' سلیم یہ کہہ کر زمین پر لیٹ گیا۔

صادق نے آگے بڑھ کر سلیم کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''غلام علی! یہ بخار سے جل رہے ہیں۔ آؤ! انہیں پار پہنچا دیں۔''

سلیم بولا ''نہیں! نہیں!! تم ان لوگوں کی فکر کرو، میں ٹھیک ہوں۔ تم کام کرو۔ لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرو۔ اناج کی خالی بوریاں ریت سے بھر لو اور کنارے سے تھوڑے دور تین چار مورچے بنا لو۔''

غلام علی اور صادق علی نے اٹھا کر سلیم کو ایک جھاڑی کے سائے میں ڈال دیا اور مورچے بنانے میں مشغول ہو گئے۔

فقیر دین ملاح اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ ''بھائیو! آج ہمارا امتحان ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جب تک یہ لوگ پار نہیں پہنچ جاتے، مجھ پر نیند حرام ہے۔''

آدھی رات تک ملاح ایک ہزار آدمیوں کو نکال چکے تھے۔ بعض آدمی قافلے کے ساتھ پل عبور کرنے کے بعد اپنے اپنے عزیزوں کو لینے کے لیے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب کوئی پانچ سو آدمی باقی تھے اور ملاحوں کو یہ یقین تھا کہ وہ تیسرے پہر تک انہیں بھی پار پہنچا دیں گے۔ لیکن بارہ بجے کے قریب ڈیڑھ سو مسلمانوں کا ایک نیا قافلہ وہاں پہنچ گیا اور انہوں نے اطلاع دی کہ سکھوں کا جتھا ان کے تعاقب میں آرہا ہے۔ انہوں نے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نالہ کرن عبور کیا تھا اور راستے میں زخمیوں اور شہیدوں کو چھوڑتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ وہ ملاح جو اس کنارے پر تھے، یہ اطلاع ملتے ہی کشتیاں بھر کر واپس چلے گئے۔ فقیر دین نے سلیم کو لے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا۔ ''نہیں! ابھی میرے ہاتھ بندوق چلا سکتے ہیں۔''



ایک بجے کے قریب جب دوسرے کنارے پر بندوقوں کی تڑتڑ سنائی دے رہی تھی تو تین آدمی بھاگتے ہوئے ملاحوں کے پاس پہنچے۔ ان کی فوجی وردیاں دیکھ کر ملاح ان کے گرد جمع ہو گئے۔

ایک نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''یہی پتن ہے۔'' پھر وہ ملاحوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمیں جلدی سے پار پہنچا دو۔''

ایک ملاح نے جواب دیا۔ ''ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن آپ تین آدمی وہاں

جا کر کیا کر سکیں گے۔ آپ آئے بھی تو تین آدمی، اور وہ بھی دو رائفلوں کے ساتھ۔ اور وہاں شاید ایک پوری فوج گولیاں برسا رہی ہے۔"

نوجوان نے کہا۔"خدا کے لیے وقت ضائع نہ کرو۔"

نوجوان کے ایک ساتھی نے کہا۔"کپتان صاحب! یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔ ان کے ساتھ ہمیں بات کرنے کی اجازت دیجیے۔"

فقیر دین ملاح نے آگے بڑھ کر کہا۔"بھائی صاحب! آپ ناراض نہ ہوں۔ کپتان صاحب کے سپاہی اس جگہ کی حالت دیکھ گئے تھے۔ وہاں صرف بیمار اور زخمی ہیں۔ وہ بارود کی چند گولیاں دے گئے تھے جن کی بدولت پانچ چھ آدمی جتھے کو روکے ہوئے ہیں۔ جب تک یہ پانچ چھ آدمی ڈٹے ہوئے ہیں، سکھ گولیاں برساتے رہیں گے۔ جب ان کی بارود ختم ہو جائے گی تو وہ چند منٹوں میں کیمپ کا صفایا کر دیں گے۔ کپتان صاحب کو اگر آنا تھا تو کچھ ساتھ لے کر آتے۔"

نوجوان نے کہا۔"بھائی! میں سیدھا لاہور سے آ رہا ہوں۔ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر جیپ کا راستہ نہیں تھا۔ ہمیں وہاں سے پتہ چلا کہ فوج کیمپ کے آدمیوں کو نکال کر پل کی طرف لے گئی ہے اور جو آدمی رہ گئے ہیں، انہیں تم لوگ کشتیوں کے ذریعے پاکستان لا رہے ہو۔ میں اپنے ایک عزیز کی تلاش میں آیا ہوں اور اس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ وہ آخری وقت تک وہاں ڈٹا رہے گا...... میں سلیم کا عزیز ہوں۔ شاید تم میں سے کسی کو اس کا علم ہو۔"

سلیم کا نام سن کر بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ فقیر دین نے کہا!

”کپتان صاحب! وہ بیمار ہے لیکن آپ ایک پہاڑ کو اٹھا کر اس طرف لا سکتے ہیں، اسے نہیں لا سکتے۔ اسے یہاں لانے کے لیے جتھے کو شکست دینا ضروری ہے۔“

نوجوان نے کہا۔”میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ مجھے پار پہنچا دو۔ شاید اس کی جان بچا سکوں۔“

”آیئے!“

فقیر دین نے آگے بڑھ کر کشتی کا رسا کھولا اور کپتان اور اس کے دو ساتھی کشتی پر سوار ہو گئے۔

ابھی وہ کوئی دس گز دور گئے تھے کہ فقیر دین کو چاند کی دھندلی روشنی میں کنارے کے ساتھ آدمیوں کی ایک ٹولی دکھائی دی اور اس نے کہا۔”کپتان صاحب! شاید بلوچ رجمنٹ کے سپاہی آ رہے ہیں۔“

کپتان بولا۔”اب پیچھے مت دیکھو۔ جلدی پہنچو۔“

تھوڑی دور اور آگے جانے کے بعد فقیر دین کنارے سے اپنے ایک ساتھی کی آوازیں سن رہا تھا۔”فقیر دین! فقیر دین! ٹھہرو!..........سپاہی آ گئے ہیں۔“

فقیر دین نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔”نہیں دوسری کشتی پر لے آؤ! میں اب منجدھار میں پہنچ چکا ہوں۔“

فقیر دین نے کچھ دور کشتی روک لی اور کہا۔”یہاں ران کے برابر پانی ہے۔ آپ یہاں اتر جائیں، میں کشتی کو تھوڑی دور پیچھے روک کر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔“

کپتان ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں دوائیوں کا تھیلا لیے کشتی سے اتر

پڑا۔

کیمپ کے مرد اور عورتیں کنارے پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر ریت کی بوریوں کے تین مورچے تھے۔ سامنے کوئی ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے حملہ آوروں کی بندوقیں آگ اگل رہی تھیں اور مورچے میں بیٹھے ہوئے آدمی ان کی گولیوں کے جواب میں اکا دکا فائر کر رہے تھے۔

کپتان اور اس کے ساتھی ریت پر رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ کنارے پر لیٹے ہوئے مایوس انسان قدرے پر امید ہو کر لیٹے لیٹے ایک دوسرے کی طرف اشارے کرنے لگے۔ ایک آدمی کو غلط فہمی ہوئی اور اس نے جھپٹ کر کپتان کے ایک ساتھی کی رائفل چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

سپاہی اس کی اس حرکت پر حیران ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کپتان جو آگے جا چکا تھا، جلدی سے پیچھے مڑا اور بولا۔ ''بھائی! ہم دوسرے کنارے سے آئے ہیں۔ ادھر دیکھو، دوسری کشتی پر فوج آ رہی ہے۔'' لوگ دوسرے کنارے کی طرف دیکھنے لگے۔ آٹھ دس گز دور دشمن کے مارٹر کا بم پھٹا۔ چند عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دیں۔ بدحواس آدمی نے بندوق چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! معاف کرنا، میں سمجھا تھا تم دشمن کے آدمی ہو اور مورچے پر حملہ کرنے جا رہے ہو۔''

کپتان نے ایک مورچے کے قریب پہنچ کر آواز دی۔ ''سلیم! سلیم!!''

''کون ہے؟'' ایک آدمی نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

کپتان نے کہا۔ ''میں سلیم کو تلاش کر رہا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟''

''سلیم اس مورچے میں ہے۔'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم فوجی ہو! ٹھہرو! مجھے کچھ بارود دیتے جاؤ!''

کپتان کے اشارے سے اس کا ایک ساتھی مورچے میں بیٹھ گیا اور کپتان دائیں ہاتھ دوسرے مورچے کی طرف بڑھا۔ ایک گولی اس کے سر کے بالوں اور دوسری پیٹھ کے ساتھ چھوتی ہوئی گزر گئی۔

مارٹر کے دو گولے یکے بعد دیگرے چند قدم کے فاصلے پر پھٹے اور لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے ساتھی کے بازو میں پیوست ہو گیا۔

''سلیم............ سلیم............!'' کپتان نے مورچے کے پاس پہنچ کر کہا لیکن سلیم کی بجائے کسی اور آدمی کی آواز سن کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

''سلیم بے ہوش ہے۔ تم کون ہو............؟'' مورچے سے ایک آدمی نے کہا۔

کپتان جواب دیے بغیر آگے بڑھا۔ سلیم بوریوں کی آڑ میں لیٹا ہوا تھا۔ کپتان نے جلدی سے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ کب سے بے ہوش ہے؟''

ابھی تھوڑی دیر ہوئی، بم کا ٹکڑا اس کی ٹانگ پر لگنے سے زخم آ گیا ہے لیکن بے ہوشی کی وجہ زخم سے زیادہ اس کا بخار ہے۔ اسے صبح سے بہت تکلیف ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟

''میں بہت دور سے آیا ہوں۔''

''آپ نے کشتی پر دریا عبور کیا ہے؟''

''ہاں!''

''اگر کشتی واپس نہیں چلی گئی تو خدا کے لیے انہیں لے جائیے! ہماری بارود ختم ہونے والی ہے۔''

''میرے پاس کافی بارود ہے۔'' کپتان کے ساتھی نے مورچے میں بیٹھ کر اپنی بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا۔''ڈاکٹر صاحب! اگر پچھلی کشتی پر فوج کے آدمی آ رہے ہیں تو بہت جلد میدان خالی ہو جائے گا۔اس وقت گولیوں کی بارش میں انہیں یہاں سے نکالنا خطرناک ہے۔''

مورچے میں بیٹھنے والے دو آدمیوں نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔''فوج آ رہی ہے؟''

''ہاں!'' کپتان نے جواب دیا اور سلیم کی رائفل اٹھا کر مورچے میں بیٹھ گیا۔

مورچے سے ایک آدمی نے گھٹنوں کے بل ہو کر دریا کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔''کشتی نیچے جا رہی ہے۔وہ شاید دائیں بازو سے حملہ کریں گے۔''

پندرہ منٹ کے بعد فوج کے سپاہیوں نے فضا میں روشنی کا گولہ پھینکا اور اس کے ساتھ ہی مارٹر کے چند گولے پھینک دیے۔دو منٹ کے بعد سکھ یہ کہتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔''فوج آ گئی! فوج آ گئی! بلوچ رجمنٹ آ گئی!''



چوتھا حصہ

اے قوم!

سلیم کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک صاف ستھرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا پایا۔ کمرے میں چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بجلی کا بلب روشن تھا۔ وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں بتی کی طرف دیکھتا رہا۔ ''میں کہاں ہوں؟'' اس کے دل میں خیال آیا اور اس پرسکون فضا میں کئی ہنگامے بیدار ہو گئے۔ انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ پر پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار اور بندوقوں کی تڑاخ پڑاخ سننے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آگ کے مہیب شعلے رقص کرنے لگے۔ آگ کے شعلوں میں اسے اپنے گاؤں اور اپنے خاندان کے بچوں، عورتوں اور مردوں کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ پھر آگ آہستہ آہستہ بجھ گئی اور یہ صورتیں غائب ہو گئیں۔ سلیم دوبارہ ہوش میں آ چکا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار، بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور بموں کے شور کی بجائے وہ میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کی ٹک ٹک سن رہا تھا کچھ دیر وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ''میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں؟'' یہ سوال اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا بستر ٹٹولا۔ ''یہ خواب نہیں ہو سکتا'' اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

بائیں ہاتھ گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ سامنے کی دیوار میں دو کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان میں سے پھولوں سے لدی ہوئی بیل کی شاخیں نظر آ رہی تھیں۔ کھڑکی کے قریب ایک سٹول پر مٹی کی ایک صراحی اور شیشے کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ باہر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے باعث درخت کے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔

سلیم نے بائیں کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن دایاں بازو ہلانے سے اسے تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنا بازو ٹٹول کر دیکھا اس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ دریا کے کنارے اس نے آخری منظر خواب کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ جب حملہ ہوا تھا تو وہ غلام علی اور صادق کے ساتھ مورچے میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر شاید اسے گولی لگی تھی .... نہیں، شاید اس کے نزدیک بم پھٹا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ دریا کہاں ہے؟ میرے ساتھی کہاں ہیں؟ میں کہاں ہوں؟ اُف! میں شاید سکھوں کی قید میں ہوں۔ لیکن یہ بستر، یہ کمرہ، یہ بجلی کی روشنی، سکھ تو لاشوں کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ اگر میں ان کے ہاتھ آتا تو وہ مجھے زندہ کیوں چھوڑتے؟ اس نے اپنے دائیں بازو کو دوسرے ہاتھ کا سہارا دے کر آہستہ سے کروٹ بدلی اسے میز کے ساتھ کرسی پر کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی دی۔ اس کے سر میں پھر ایکبار چکر آنے لگے۔ اس دفعہ بیہوشی کا دورہ بہت مختصر تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ ہوش میں آ کر اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ ”یہ خواب ہے۔ نہیں، یہ خواب نہیں۔“ میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی جس کی سوئیاں سوا چار بجے کا وقت دکھا رہی تھیں۔ دوسری میز پر دوائی کی شیشیاں اور ٹیکے کا سامان

پڑا ہوا تھا۔ بجلی کا بلب روشن تھا۔ کھڑکی سے بیل نظر آ رہی تھی درخت کے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور اپنے دائیں بازو میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور زندگی کی ایک جیتی جاگتی حقیقت اس کے سامنے تھی .... عصمت اس سے صرف دو بالشت دور آرام کرسی پر سو رہی تھی۔ کرسی کے ایک بازو پر اس کا ایک ہاتھ سلیم سے اس قدر قریب تھا کہ وہ اسے چھو سکتا تھا۔ ''عصمت! میری عصمت! میری زندگی! میری روح! وہ بولنا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی .... وہ محویت کے اس عالم میں تھا جہاں وقت کے قدم رک جاتے ہیں۔''

ساڑھے چار بج گئے۔ پانچ بج گئے اور پھر اچانک ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ عصمت نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ جلدی سے الارم بند کیا اور پھر سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک اس کے دل و دماغ کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ پھر اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی ''اللہ تیرا شکر ہے۔ تیرا شکر ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے .... اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ ''اللہ تیرا شکر ہے .... میرے اللہ تیرا شکر ہے۔'' عصمت سسکیاں لے رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں عصمت، میں ٹھیک ہوں۔'' سلیم نحیف آواز میں کہہ رہا تھا۔ عصمت آنسو پونچھتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور میز سے تھرمامیٹر اٹھا کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

''میں آپ کا ٹمپریچر دیکھ لوں، لیجیے!''

سلیم کے ذہن میں کئی سوالات تھے۔ عصمت نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگا کر اسے خاموش کر دیا اور کوئی دو منٹ کے بعد عصمت نے تھرمامیٹر نکال کر دیکھتے ہوئے کہا:

''اب آپ کا ٹمپریچر ایک سو ایک ہے۔''

سلیم نے کہا۔ ''اگر یہ خواب نہیں تو مجھے بتایئے میں کہاں ہوں؟''

''ہم لاہور میں ہیں۔''

''لاہور! لیکن میں یہاں کیسے پہنچا؟''

''میں آپ کو انجکشن دے لوں، پھر آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔'' عصمت یہ کہہ کر انجکشن کا سامان تیار کرنے لگی۔

''عصمت''

عصمت نے مڑ کر دیکھا۔ سلیم نے پھر کہا۔ ''عصمت ٹھہرو۔ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤ!''

ان الفاظ میں ایک درخواست تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک حکم تھا۔ عصمت کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلیم نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ عصمت! میں یہاں کیسے پہنچا؟''

آپ کو بھائی ارشد لے کر آئے تھے۔ وہ دہلی سے یہاں پہنچتے ہی آپ کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ بھائی جان نے آپ کو بیہوشی کی حالت میں وہاں سے نکالا تھا۔

''لیکن ان کا کیا حشر ہوا؟ ان عورتوں اور بچوں کا کیا ہوا؟ اور وہ زخمی اور بیمار

لوگ؟" سلیم نے انتہائی کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔

عصمت نے کہا "بھائی جان کہتے ہیں کہ وہاں مسلمان سپاہی پہنچ گئے تھے اور وہ سکھوں کے جتھے کو بھگانے کے بعد سب کو حفاظت سے نکال کر لے آئے تھے۔"

"فوج کے سپاہی! کاش یہ درست ہو۔" سلیم نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے بعض آپ کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ شاید آج بھی کوئی آئے۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے۔"

سلیم نے سوال کیا "مجھے یہاں آئے ہوئے کتنے دن ہوئے؟"

عصمت نے جواب دیا۔ "گیارہ دن۔"

"گیارہ دن! میں گیارہ دن سے یہاں پڑا ہوا ہوں؟"

"نہیں۔ آپ کو یہاں ساتواں دن ہے.......... پہلے آپ ہسپتال میں تھے۔ آپریشن کے بعد آپ کو بھائی جان لے آئے تھے۔ وہاں کسی ڈاکٹر یا نرس کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ زخمیوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔"

سلیم نے پوچھا۔ "ارشد کہاں ہے؟"

ارشد اور ابا جان برآمدے میں سو رہے ہیں۔ وہ رات کو دو بجے کیمپ سے ڈیوٹی دے کر آئے تھے اور اب نماز پڑھتے ہی پھر چلے جائیں گے۔ کئی دنوں سے ان کی یہی حالت ہے۔

"تو میں گزشتہ سات دن سے بے ہوش ہوں؟"

"جی ہاں! آپ کا بخار بہت تیز تھا۔ کل شام تک آپ کا ٹمپریچر ایک سو چار تھا۔ رات کے دو بجے جب بھائی جان نے دیکھا تھا تو آپ کا ٹمپریچر ایک سو تین سے ذرا نیچے تھا اور انہیں پہلی بار تھوڑا سا اطمینان ہوا تھا۔"

"آپ کو اتنے دن بہت تکلیف ہوئی ہوگی!"

"تکلیف! مجھے تکلیف!" عصمت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ راحت آنکھیں ملتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آپا جان! سوا پانچ بج گئے۔ آپ نے مجھے کیوں نہ جگایا۔ آج پھر ساری رات جاگی ہیں۔ جائیے! آرام کیجیے.........!"

عصمت نے کہا۔ "راحت اب یہ ہوش میں ہیں۔"

راحت نے آگے بڑھ کر سلیم کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ راحت سلیم سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ ہر روز سوچا کرتی تھی کہ جب سلیم کو ہوش آئے گا تو میں انہیں کئی واقعات بتاؤں گی۔ ان سے کئی سوالات پوچھوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی بھائی جان! آپ اتنے دن بے ہوش رہے۔ آپ بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑایا کرتے تھے۔ آپ فلاں فلاں نام کے لوگوں کو آوازیں دیا کرتے تھے۔ فلاں دن آپ نے سخت بخار کی حالت میں میری طرف دیکھ کر کہا تھا زبیدہ بھاگ جاؤ! انہوں نے مکان کو آگ لگا دی ہے۔ اور فلاں دن جب بھائی جان

آپ کی نبض دیکھ رہے تھے تو آپ کہہ رہے تھے.........واؤ ڈیلیٹ جاؤ۔ تمہیں گولی لگ جائے گی۔ فلاں دن عصمت ساری رات سجدے میں سر رکھ کر دعائیں مانگتی رہی۔ لاہور میں اتنے لاکھ انسانوں کے قافلے آ چکے ہیں۔ کیمپوں میں اتنے ہزار زخمی اور بیمار مر چکے ہیں۔ ہندوستان سے اتنی گاڑیاں آئی ہیں جن میں صرف لاشیں تھیں۔ میں ان سے کیمپ کے حالات پوچھوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ آپ سے جدا ہونے کے بعد عصمت کی کیا حالت تھی۔ وہ کس طرح رو رو کر دعائیں مانگا کرتی تھی لیکن اب سلیم آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ خاموش کھڑی تھی۔

عصمت نے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ راحت!'' اور وہ ایک کرسی گھسیٹ کر عصمت کے قریب بیٹھ گئی اور قدرے توقف کے بعد بولی ''بھائی جان! اب آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''میں ٹھیک ہوں راحت!'' سلیم نے جواب دیا۔

صبح ہو رہی تھی۔ ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ انگڑائی لینے کے بعد آگے بڑھا۔ راحت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ارشد نے کہا ''تم دونوں جاگ رہی ہو! اب بخار کچھ کم ہوا؟''

راحت بولی ''بھائی جان! اب ان کو آرام ہے۔ یہ ہوش میں ہیں۔''

ارشد نے آگے بڑھ کر سلیم کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''عصمت! تم نے ٹمپریچر لیا ہے؟''

''ہاں بھائی جان! اب ایک سو ایک ہے۔ آپ انجکشن لگا دیں۔'' عصمت یہ

کہتے ہوئے اٹھی اور انجکشن کا سامان درست کرنے لگی۔

ارشد نے نبض دیکھنے کے بعد سلیم کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ’’اب تمہاری طبیعت کیسی ہے سلیم؟‘‘

سلیم نے کہا ’’مجھے یہ بتاؤ کہ دریا کے کنارے جو لوگ میرے ساتھ تھے ان کا کیا حشر ہوا؟‘‘

’’وہ سب پاکستان پہنچ چکے ہیں۔‘‘

’’تم فوج کے سپاہی لے کر گئے تھے؟‘‘

’’میرے ساتھ صرف دو آدمی تھے لیکن میرے دریا عبور کرتے ہی بلوچ رجمنٹ کا ایک حوالدار آٹھ سپاہیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ وہ دن کے وقت کیمپ سے قافلہ لے کر گیا تھا۔ تم نے اسے فالتو ہتھیار بھی دیے تھے۔‘‘

ارشد نے انجکشن لگانے کے بعد سلیم کے زخم پر نئی پٹی باندھی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر شوکت بھی بستر سے اٹھ کر اندر آ گئے۔ گزشتہ صدمات اور تکالیف کے باعث وہ اسقدر نحیف اور لاغر ہو چکے تھے کہ انہیں پہچاننا مشکل تھا۔ تاہم سلیم کو روبصحت دیکھتے ہی ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی آ گئی۔ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔ ’’عصمت بیٹی! اب انہیں خط لکھ دو کہ سلیم ہمارے پاس ہے۔ وہ بہت پریشان ہوں گے۔ پرسوں بھی ان کا خط آیا تھا۔‘‘

’’کس کا خط؟‘‘ سلیم نے چونک کر سوال کیا۔

’’امینہ کا خط۔ وہ تمہارے متعلق بہت پریشان ہے!‘‘

’’امینہ کو معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟‘‘

ڈاکٹر شوکت نے جواب دیا۔ ’’نہیں! ابھی اسے معلوم نہیں۔ میں یہاں پہنچتے ہی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا تھا، اس لیے اسے تفصیلات سے آگاہ نہ کر سکا۔ بستر پر پڑے پڑے میں نے لیڈروں اور حکومت کے عہدیداروں کو چند خطوط لکھے تھے لیکن کسی نے مجھے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ عصمت کا خیال تھا کہ تم دریا عبور کرنے کے بعد سیدھے امینہ کے پاس پہنچو گے۔ اس لیے اس نے وہاں خط لکھ کر تمہارے متعلق پوچھا۔ کئی دن تک امینہ کا کوئی جواب نہ آیا۔ تمہاری آمد سے دو دن پہلے امینہ کے شوہر کا خط ملا اور ہمیں معلوم ہوا کہ تاخیر کی وجہ گھر سے ان کی غیر حاضری تھی۔ تمہارے گاؤں کے کسی آدمی نے انہیں اطلاع دی تھی کہ مجید سیالکوٹ میں کسی کے ہاں زیر علاج ہے اور وہ امینہ کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔‘‘

سلیم نے پوچھا۔ ’’مجید کے متعلق انہوں نے کچھ اور لکھا ہے؟‘‘

’’مجید کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ٹھیک ہے اور اسے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔‘‘

سلیم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا تو مجید اب امینہ کے پاس ہے؟

’’ہاں!‘‘

’’آپ نے میرے متعلق کیا لکھا ہے؟‘‘

’’تمہاری حالت ٹھیک نہ تھی۔ اس لیے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں ہوش آ جائے تو ان سب کو یہاں بلا لوں۔ عصمت

تم آج ہی امینہ کو خط لکھ دو۔''

سلیم نے کہا ''نہیں، میں خود ہی وہاں جاؤں گا۔ امینہ کو مجید کے پاس رہنا چاہیے۔''

ارشد نے کہا ''ابا جان! عورتوں کے لیے گاڑی میں سفر کرنا اب ناممکن ہو چکا ہے اور ہیضہ بھی زوروں پر ہے۔ میں انہیں تسلی کا خط لکھ دیتا ہوں۔''

دس دن اور گزر گئے۔ سلیم کا زخم اب ٹھیک ہو چکا تھا۔ ایک صبح وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عصمت اور راحت برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ کھڑکی کے سامنے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ دو چڑیاں درخت سے اتر کر کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔ سلیم ان کی طرف دیکھتا رہا تھوڑی دیر میں چند چڑیاں اور آ بیٹھیں۔

سلیم آہستہ سے اٹھا اور سرہانے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چڑیاں اڑ گئیں۔ برآمدہ میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ سلیم نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر بستر کے قریب پڑی ہوئی تپائی سے تھرمامیٹر اٹھایا اور منہ میں رکھ کر بیٹھ گیا۔

عصمت اندر داخل ہوئی۔ سلیم کے منہ میں تھرمامیٹر دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ سلیم نے ہاتھ سے اشارہ کا اور وہ چپکے سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

راحت نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپا! ناشتہ تیار کروں؟''

''ہاں جلدی کرو۔''

راحت نے سلیم سے پوچھا۔ ''بھائی جان! کیا حال ہے آپ کا؟''

سلیم نے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر عصمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں راحت!''

راحت چلی گئی۔ عصمت نے تھرمامیٹر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج بالکل ٹھیک ہیں!''

''ڈاکٹر صاحب اور ارشد چلے گئے!''

وہ آج رات نہیں آئے۔ کیمپوں میں وزخمیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے اور ہیضہ بھی زوروں پر ہے.........اس طرح بیٹھنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ میں آپ کے لیے تکیے لاتی ہوں۔ عصمت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

کھڑکی میں چڑیاں دوبارہ جمع ہو رہی تھیں۔ عصمت تکیے لے کر آئی تو سلیم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی کوشش کی۔ عصمت نے پریشان ہو کر دبے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے کہا ''کیا ہے؟ چڑیاں اچانک اڑ گئیں اور سلیم نے کہا۔ تم نے انہیں ڈرا دیا۔''

''یہ چڑیاں!'' عصمت نے اس کے سرہانے تکیے رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ بیہوش رہا کرتے تھے تو یہ کبھی کبھی اندر آ کر آپ کے بستر پر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔''

سلیم نے کہا '' گاؤں کی چڑیاں مجھ سے بالکل نہیں ڈرتی تھیں اور بچپن میں کوے تو میرے ساتھ اس قدر مانوس تھے کہ میرے ہاتھ سے روٹی چھین کر لے جایا کرتے تھے۔ چڑیوں کے بچے کبھی کبھی گھونسلوں سے گر پڑتے تو میں انہیں دوبارہ

وہاں رکھ دیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں بہت سے پرندے آیا کرتے تھے۔ برسات کی جھڑیوں میں چھت پر ان کے لیے دانے بکھیر دیا کرتا تھا۔ مجید کبھی کبھی انہیں پکڑنے کے لیے چھت پر پھندا لگا دیا کرتا تھا لیکن میں اس سے لڑا کرتا تھا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا کہ یہ پرندے میرے ہیں۔ تم باہر سے پکڑو۔ عصمت! کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ وہ پرندے اب کیا سوچتے ہوں گے۔ ان کے چیچے اب کون سنتا ہو گا۔ وہ راکھ کے انبار دیکھتے ہوں گے .... اور انہیں یقین نہیں آتا ہو گا کہ یہ وہی گاؤں ہے .... یہ وہی مکان ہے۔'' سلیم اچانک خاموش ہو گیا۔

عصمت کچھ دیر آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ سلیم آج تک اپنے گھر یا گاؤں کا ذکر چھیڑنے سے اجتناب کیا کرتا تھا۔ جب کوئی یہ مسئلہ چھیڑتا تو وہ مختصر سے جواب کے بعد اسے ٹالنے کی کوشش کرتا لیکن آج وہ اپنے معمول کے خلاف بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ عصمت نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے پوچھنے کا حق ہے تو مجھے تمام واقعات سنائیے۔''

سلیم نے کہا۔ ''عصمت! میں سمجھتا تھا کہ میں صرف دلکش کہانیاں سنانے کے لیے پیدا ہوا ہوں .... اور تم صرف پھولوں سے کھیلنے کے لیے پیدا ہوئی ہو لیکن اب میری جھولی میں بجھی ہوئی راکھ کے سوا کچھ نہیں .... تمہیں یاد ہے عصمت! جب بچپن میں میں تمہیں خوفناک کہانیاں سنایا کرتا تھا، تم ڈر جایا کرتی تھیں اور تمہارے چہرے پر پریشانی اور خوف دیکھ کر میں اچانک کہانی کا رخ بدل دیا کرتا تھا۔ میں تمہارے چہرے پر صرف مسکراہٹیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ

میں نے جان بوجھ کر تمہیں پریشان کرنے کے لیے ایک کہانی کا انجام المناک بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی کہانی کے ہیرو کو اژدہے کے منہ میں ڈال دیا تھا لیکن تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور میں نے یہ کہہ دیا کہ اژدہا پر بجلی گری اور ہیرو کی جان بچ گئی۔ میری کہانی بھی اژدہوں اور انسانوں کی کہانی ہے۔ انسان سو رہے تھے اور اژدہے ان پر ٹوٹ پڑے۔ کاش میں ان پر بجلیاں گرا سکتا اور اس کہانی کا انجام بدل سکتا۔ لیکن عصمت اس دن کا انتظار کرو جب میں یہ کہتا ہوا تمہارے پاس آؤں کہ ہم نے خوفناک اژدہوں کے جبڑے چیر دیے ہیں۔ ہم نے بھیڑیوں کو انسانوں کی بستی سے نکال دیا ہے۔''

عصمت نے کہا۔ ''میں اژدہوں اور بھیڑیوں کو دیکھ چکی ہوں۔ اب میں ہر کہانی سن سکتی ہوں۔ آپ نے اس دن کہا تھا، یہ راکھ میری پونجی ہے لیکن وہ صرف آپ کی پونجی نہیں .... ہم دونوں کی پونجی ہے۔ میں صرف آپ کی مسکراہٹوں کی حصے دار نہیں، آپ کے آنسوؤں میں میں بھی میرا حصہ ہے۔ اگر آپ کے باغ کے پھول میرے لیے تھے تو آپ کے جلے ہوئے خرمن کے انگارے بھی میرے لیے ہیں۔ آپ تنہا نہیں ہیں .... ابا جان کہتے تھے کہ باتیں کرنے سے آپ کے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ میں آپ کے خاندان کے متعلق دوسروں سے بہت کچھ سن چکی ہوں لیکن مجھے شکایت ہے کہ آپ نے اب تک مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ میں آپ سے وہ باتیں سن سکوں جو انسان صرف اپنے لیے کرتا ہے۔''

''عصمت! میں نہیں چاہتا کہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو لیکن میں تمہیں بتاتا

ہوں۔ میں تمہیں شروع سے آخر تک بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سلیم نے قدرے توقف کے بعد اپنی سرگزشت شروع کر دی۔ جب وہ اپنے گھر کا آخری منظر بیان کر رہا تھا، عصمت کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ سلیم نے کہا۔ عصمت تم رو رہی ہو؟

عصمت نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری آنکھوں کے آخری آنسو تھے۔''

باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ارشد نے دروازے میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا حال ہے سلیم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

ارشد نے عصمت کی طرف دیکھا اور وہ بولی۔ ''آج ٹمپریچر ننانوے سے ذرا اوپر ہے۔''

''انشاء اللہ کل تک یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ناشتہ تیار نہیں کیا؟''

باورچی خانے سے راحت کی آواز آئی۔ ''ناشتہ تیار ہے بھائی جان! میں لاتی ہوں۔''

عصمت نے پوچھا۔ ''ابا جان نہیں آئے؟''

ارشد نے جواب دیا ''وہ شاید چند دن اور نہ آئیں۔ کل دوپہر کو وہ واہگہ چلے گئے تھے اور وہاں سے اطلاع آئی تھی کہ شام کے پانچ بجے تک دو لاکھ انسانوں کا قافلہ واہگہ پہنچ جائے گا اور قافلے میں کئی ہزار انسان بیمار اور زخمی ہیں۔''

راحت ناشتہ اور چائے لے آئی۔ ارشد نے جلدی جلدی چائے کی ایک پیالی

ختم کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’سلیم! تم اطمینان سے اپنا حصہ ختم کرو۔ میں بارہ بجے کے بعد پھر آؤں گا۔‘‘

سلیم نے کہا ’’ارشد! میں جانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کہاں؟‘‘ ارشد نے چونک کر پوچھا۔

’’امینہ کے پاس۔ اب میں سفر کرسکتا ہوں۔‘‘

ارشد نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ’’سلیم! ابھی تم تندرست نہیں ہوئے۔ میں تمہیں ایک ہفتہ اور باہر نکلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم یہاں بیٹھے سفر کی مشکلات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ عصمت تم امینہ کو خط لکھ دو کہ سلیم اب بالکل ٹھیک ہے۔ دس دن تک تمہارے پاس آئے گا۔‘‘

’’نہیں! نہیں!! اسے صرف اتنا لکھو کہ میں ٹھیک ہوں اور عنقریب وہاں پہنچوں گا۔‘‘



پانچ دن کے بعد سلیم، ارشد اور ڈاکٹر شوکت دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ عصمت اور راحت پڑوس کی چند لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مکان سے باہر سڑک پر ایک فوجی ٹرک رکا، ایک نوجوان اترا اور اس نے پھاٹک میں کھڑے ہوکر آواز دی۔ ’’ڈاکٹر صاحب!‘‘

’’کون ہے؟‘‘ نوکر نے باورچی خانے سے نکل کر پوچھا۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ ’’ڈاکٹر شوکت صاحب یہیں رہتے ہیں؟‘‘

''ہاں۔ اندر کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ جائیں، وہ ابھی باہر نکلیں گے۔''

نوجوان نے برآمدے کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''مجھے جلدی ہے۔ میں سلیم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔''

یہ آواز سلیم کے کانوں کے لیے نئی نہ تھی۔ روٹی کا نوالہ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا اور وہ جلدی سے اٹھ کر مجید مجید کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

مجید فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ نحیف اور لاغر نظر آتا تھا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

ارشد اور شوکت بھی باہر نکل آئے۔ مجید نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! معاف کیجیے، میں نے آپ کے بے وقت تکلیف دی لیکن مجھے بہت جلدی تھی۔''

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیسی جلدی، چلو، کھانا کھاؤ!''

''کھانا میں کھا چکا ہوں۔''

ارشد نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آیئے! اندر بیٹھیے!''

مجید نے کہا۔ ''میں یہیں سے اجازت لے لوں تو بہتر ہے۔ میرے ساتھی باہر کھڑے ہیں۔''

ارشد نے کہا۔ ''آپ چلیں، میں انہیں لے آتا ہوں۔''

''نہیں۔ میں واپسی پر آپ سے ملوں گا۔''

''تم کہاں جارہے ہو؟''سلیم نے سوال کیا۔

مجید نے کہا۔''میں نے آج صبح یہاں پہنچتے ہی ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کی تھی اور وہاں سے مجھے کنوائے کے ساتھ لدھیانے پہنچنے کا حکم ملا ہے۔لدھیانے کے نزدیک پچاس ہزار آدمیوں کا ایک قافلہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔میں ایک منٹ ضائع کیے بغیر وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ہم دو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے اور اب ایک بج کر چالیس منٹ ہو گئے ہیں۔''

''تمہاری صحت اب ٹھیک ہے نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں سلیم۔تم کیسے ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔''

مجید نے کہا''داؤد..........؟''

''وہ شہید ہو چکا ہے''..........سلیم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور دوسرے؟''

''صادق اور غلام علی بھی آخری وقت تک میرے ساتھ تھے،وہ پاکستان پہنچ چکے ہیں۔''

''اچھا سلیم!اب میں جاتا ہوں۔تم جب سفر کے قابل ہو جاؤ تو امینہ کے پاس ضرور جانا۔وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔بشیر کو بھی میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔''

''میں کل جا رہا ہوں۔''سلیم نے کہا۔

مجید نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''بہت اچھا،اب میں جاتا

ہوں۔ مجھے دو بجے سے پہلے واپس چھاؤنی پہنچنا ہے۔ مجید نے مصافحہ کے لیے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے کہا۔ ہم سڑک تک تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔''

عصمت اور راحت دروازے میں کھڑی باہر جھانک رہی تھیں۔ جب ڈاکٹر شوکت، سلیم اور ارشد، مجید کو الوداع کہنے کے لیے باہر نکل گئے تو وہ برآمدے میں آ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کے انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک لڑکی نے عصمت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کون تھا عصمت؟''

عصمت نے مڑ کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ وہی تھے جن کے متعلق میں تمہیں ابھی بتا رہی تھی..........''



''مائی ڈیر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ میری ریاست میں تشویشناک صورت حالات پیدا ہو گئی ہے۔ اور میں آپ کی حکومت سے فوری امداد کا ملتجی ہوں۔ موجودہ صورتِ حالات میں میرے لیے ہندوستان سے اعانت طلب کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میری درخواست پر اس وقت تک مدد نہیں بھیج سکتا جب تک میری ریاست (کشمیر) کا ہندوستان کے ساتھ الحاق نہیں ہو جاتا۔

لہذا میں نے الحاق کا فیصلہ کیا ہے اور متعلقہ درخواست آپ کی منظوری کے لیے بھیج دی ہے۔.......... اگر میری ریاست کو بچانا مقصود ہو تو سری نگر کے لیے فوری اعانت کی ضرورت ہے۔

آپ کا مخلص

ہری سنگھ''

''میرے پیارے مہاراجہ صاحب!

آپ کے بیان کردہ حالات کے پیش نظر میری حکومت نے ہندوستان کے ساتھ ریاست کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے.......... آپ کی اپیل پر ہندوستانی فوج کے دستوں کو کشمیر بھیجنے کا انتظام کیا گیا ہے تا کہ وہ آپ کی فوج کو ریاست کے دفاع اور آپ کی رعایا کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کے لیے مدد دیں..........

آپ کا بہت ہی مخلص

ماؤنٹ بیٹن آف برما۔ گورنر جنرل ہندوستان''

یہ دو خطوط اس شرمناک سازش اور اس ذلیل منصوبے کی رہی کڑیاں تھیں جس کی تکمیل کے لیے دہلی سے لے کر واگہہ تک مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا جس کے لیے اسی لاکھ انسانوں کو

پاکستان کی طرف دھکیلا جا رہا تھا.........جس کے لیے ریڈ کلف ضمیر خریدا گیا تھا۔ جس کے لیے پاکستان کی فوجیں عمداً باہر رکھی گئی تھیں اور جس کے لیے پاکستان کے حصے کا اسلحہ ہندوستان میں روک لیا گیا تھا۔

راجہ ہری سنگھ کی رگوں میں اس ڈوگرے کا خون تھا جس نے چند لاکھ چاندی کے سکوں کے عوض کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کی آزادی خریدی تھی اور ماؤنٹ بیٹن ان فرنگی تاجروں کا جانشین تھا جنھوں نے کشمیر کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کی قیمت وصول کی تھی۔

معاہدے امرت سر کی رو سے انگریزوں نے کشمیر کو جموں کے حکمرانوں کے پاس ۷۵ لاکھ روپے میں فروخت کیا تھا۔

کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمان ایک بار پھر فروخت کیے جا رہے تھے لیکن اب یہ لین دین ڈوگرہ استبداد اور ہندو فاشزم کے درمیان تھا۔ ماؤنٹ بیٹن آف برما اس شرمناک سودے میں محض ایک دلال کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ہندوستان کی اسٹیج پر خونیں ڈرامے کا ایک نیا ایکٹ شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف نہرو اور پٹیل اپنے خونخوار بھیڑیوں کی فوجیں لیے کھڑے تھے، دوسری طرف ہری سنگھ اپنے درندہ خصلت ڈوگروں کے لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا اور کشمیری مسلمان کے وجود میں بلکتی، تڑپتی، چیختی اور چلاتی ہوئی انسانیت ان کے درمیان پابہ زنجیر کھڑی تھی۔ اسٹیج کے پردے کے پیچھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن آف برما اس ڈرامے کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں کھڑا تھا.........یہ بھیڑوں اور بھیڑیوں کا کھیل تھا اور بھیڑیوں نے بھیڑوں

کے گلے پر حملہ کرنے سے پہلے انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایک بھیڑ کو پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا.........شیخ عبداللہ جنہیں ہری سنگھ نے تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے بغاوت کے جرم میں قید کیا تھا، جن کی اعانت کے لیے دیش بھگت پنڈت نہرو کوہالہ کے پل تک تشریف لے گئے تھے اور پھر ڈوگروں کی سنگینیں دیکھ کر واپس تشریف لے آئے تھے۔اب ہندو فاشزم اور ڈوگرہ استبداد کی ایک ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جیل سے باہر نکالے گئے تھے۔ ہری سنگھ کا شیخ عبداللہ کو جیل سے نکال کر کابینہ کی تشکیل کی دعوت دینا اور ہری سنگھ کی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ خط و کتابت محض ظاہری رسومات کو پورا کرنے کے لیے تھیں۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ مشرقی پنجاب اور دوسری ریاستوں کی طرح کشمیر کے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کی تیاریاں بہت پہلے مکمل ہو چکی تھیں۔ ماؤنٹ بیٹن کے رفیق کار ریڈ کلف نے مشرقی پنجاب میں مسلم اکثریت کے علاقے میں ہندوستان میں شامل کر کے کشمیر کا ایک کونہ ہندوستان سے ملا دیا تھا اور گاندھی کے چیلے لاکھوں مسلمانوں کی لاشوں پر سے ہندو فاشزم کا رتھ دھکیلتے ہوئے کشمیر کے مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام دے رہے تھے۔

۱۵ اگست سے قبل ہی مہاراجہ پٹیالہ اور کشمیر کے حکمران کے درمیان ساز باز ہو رہی تھی کشمیر کی سرحدوں کے ساتھ مغربی پنجاب کے اضلاع سیالکوٹ، گجرات اور جہلم وغیرہ کی سکھ آبادی کو کشمیر میں منتقل ہونے کی ہدایات مل چکی تھیں۔ ستمبر میں مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے راشٹریہ سیوک سنگھ، آزاد ہند فوج کے سپاہی، اکال سینا اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے بلوائی جموں کے اضلاع میں داخل ہو کر لوٹ

مار اور قتل و غارت شروع کر چکے تھے۔ جموں کے مسلمانوں کی بستیوں میں آگ کے شعلے سیالکوٹ سے دکھائی دے رہے تھے۔ ستمبر کے آخر تک ہزاروں پناہ گزین مشرقی پنجاب میں داخل ہو چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس قسم کی خبریں مشتہر ہو رہی تھیں کہ راجہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر چکا ہے۔ کشمیر کا ایک کونہ ہندوستان کے ساتھ ملانے والے راستوں کو سڑکوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ راوی پر پل بنایا جا رہا ہے اور جب یہ انتظامات مکمل ہو جائیں گے کشمیر کی ڈوگرہ حکومت ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دے گی۔ کشمیر کی نوے فیصدی مسلم آبادی اب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ کشمیر کے ۳۵ لاکھ مسلمان اب ان خون آشام تلواروں کو اپنی شاہ رگ کے قریب دیکھ رہے تھے۔ جنہوں نے مشرقی پنجاب، دہلی، کپورتھلہ، نابھ، پٹیالہ بھرت پور اور الور میں لاکھوں نہتے اور بے بس مسلمانوں کو ذبح کیا تھا............ ان کی بہو بیٹیوں کی طرف ان درندوں کے ہاتھ اٹھ رہے تھے۔ جنہوں نے کشمیر کی شکار گاہ میں داخل ہونے سے پہلے جمنا کے اس پار سے لے کر راوی کے ساحل تک مظلوم اور بے کس انسانیت کا تعاقب کیا تھا۔

کشمیر کی گل پوش وادیوں اور زعفران کے کھیتوں کے ہندوستانی سوداگر بادِ سموم کے تیز و تند جھونکوں پر سوار ہو کر آئے تھے............ یہ جواہر لال نہرو کا آبائی وطن تھا اور چونکہ وہ بھارت کا وزیر اعظم بن چکا تھا، اس لیے گاندھی جی کے چیلے کشمیر کے ۳۵ لاکھ مسلمانوں کو آزادی سے محروم رکھنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔

کشمیر کی سرحدیں تبت، روس اور چین کے ساتھ ملتی تھیں اور اب ماؤنٹ بیٹن

اور ریڈ کلف نے اس کا ایک کونہ ہندوستان کے ساتھ بھی ملا دیا تھا۔ اس لیے پنڈت نہرو کہتا تھا کہ ہندوستان کشمیر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کشمیر کے مسلمانوں کے سامنے تاریک گڑھے اور پیچھے آگ کے مہیب شعلے تھے۔ ان کی آخری امید پاکستان تھا لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان جن حوصلہ شکن مصائب کا سامنا کر رہا تھا، وہ نہرو، پٹیل، ہری سنگھ اور ماؤنٹ بیٹن کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھے کہ ہندوستان کسی دقت کا سامنا کیے بغیر کشمیر کو ہڑپ کر سکتا ہے۔

ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں راجہ کو سب سے زیادہ پونچھ کے مسلمانوں سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ پونچھ کی آبادی میں قریباً ساٹھ ہزار وہ سابق فوجی تھے جو دوسری عالم گیر جنگ میں ملایا، برما، لیبیا اور اٹلی کے میدانوں میں لڑ چکے تھے۔ یہ سب لوگ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی صورت میں ان کا کیا حشر ہوگا............ پونچھ کے وہ سپاہی جو پاکستانی فوج میں تھے اور وہ عوام جو مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں ملازمتیں کرتے تھے، ان ریاستوں کے مسلمانوں کے انجام سے بے خبر نہ تھے۔ جو ہندوستان میں شامل ہو چکی تھیں۔

کشمیر کی حکومت نے ان لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے اپنے ڈوگرہ سپاہیوں کو قتل و غارت اور لوٹ مار کا کام سونپ دیا۔ اس ظلم کے جواب میں پونچھ کے مسلمانوں کی زبان سے پاکستان کے حق میں آواز بلند ہوئی۔ ظلم بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ یہ آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ پونچھ کے مسلمان اپنے بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو خاک و خون میں لوٹتے اور اپنے گھروں کو جلتے دیکھ رہے تھے اور انہیں

مستقبل کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی .... راجہ فوج کو یہ اختیار دے چکا تھا کہ جو شخص اس کی حکم عدولی کرے یا جس پر انہیں شبہ ہو، اسے بلا تاخیر گولی مار دی جائے۔

پانی اب سر سے گزر چکا تھا .... حالات نے پونچھ کے مسلمانوں کو آخری فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا .... جب پاکستان کے لیڈر بیانوں، احتجاجوں اور قراردادوں کے نسخے آزمارہے تھے، پونچھ میں نہتے، فرد مایہ اور تہی دست انسانوں کا ایک گروہ اٹھا اور جبر و استبداد کے طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔ وہ گمنام سپاہی یقیناً پاکستان کے سب سے بڑے محسن تھے، جنہوں نے سینوں پر گولیاں کھا کر ڈوگروں کی بندوقیں چھین لی تھیں۔ قوم ان شہیدوں کا احسان نہیں بھول سکتی۔ جنہوں نے پہلی بار ڈوگرہ استبداد کے خلاف اعلان جہاد کیا تھا ....

قدرت پھر ایک بار اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتی تھی کہ مومن جب موت کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے تو زندگی اس کے قدم چومتی ہے۔ پونچھ کی جنگ کشمیر کے عوام کی جنگ اور کشمیر کے عوام کی جنگ بالآخر پاکستان کے عوام کی جنگ بن گئی .... پونچھ کے مجاہدوں نے ایک قوم کی بقا کی جنگ کی ابتدا کی تھی اور قوم کہہ رہی تھی کہ .... میں زندہ ہوں .... جو نعرہ پونچھ سے بلند ہوا تھا، وہ چند دنوں میں مغربی پنجاب اور سرحد کے میدانوں سے لے کر وزیرستان اور چترال کے پہاڑوں تک گونج رہا تھا۔ قبائلی مجاہدین نے اپنے بھائیوں کی پکار سنی اور ان کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ ڈوگرے بھاگ رہے تھے۔ سیوا سنگھی اور اکالی بھاگ رہے تھے

.........مجاہدین کی منزل مقصود سری نگر تھی۔

حالات کی یہ تبدیلی، ہندوستان اور کشمیر کی حکومتوں کی توقع کے خلاف تھی۔ راجہ ہری سنگھ نے اپنے پیارے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ میں آپ کی فوری اعانت کا طلب گار ہوں، اور ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا کہ ہندوستانی فوج کو کشمیر بھیجنے کا انتظام کیا گیا ہے تا کہ آپ کی فوج کو ریاست کے دفاع اور آپ کی رعایا کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کے لیے مدد دے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن آف برما نے مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں ہی نہیں بلکہ دہلی میں اپنے لاج کے اردگرد مسلمانوں کا قتلِ عام ایک تماشائی کی حیثیت میں دیکھا......... جب مہاجرین کے کیمپوں، قافلوں اور گاڑیوں پر حملے ہو رہے تھے، جب ہزاروں مسلمان لڑکیوں کی عصمت لٹ رہی تھی، ماؤنٹ بیٹن کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور پھر جب مشرقی پنجاب اور ریاستوں سے مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے بعد ہندوستان کے تخریبی عناصر جموں میں قیامت بپا کر رہے تھے اور ہری سنگھ کے ڈوگرے کشمیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہے تھے، ماؤنٹ بیٹن آف برما ٹس سے مس نہ ہوا۔

کشمیر کے راجہ اور اس کے پیارے ماؤنٹ بیٹن کو اس وقت کشمیر کی رعایا کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کا خیال نہ آیا جب جموں سے چھینی ہوئی مسلمان لڑکیاں مشرقی پنجاب کے شہروں میں فروخت ہو رہی تھیں لیکن کشمیر کو ہندوستان کی جھولی میں ڈالنے اور ایک ظالم اور وحشی حکمران کے اقتدار کے ڈگمگاتے ہوئے محل کو

سہارا دینے کے لیے ماؤنٹ بیٹن کے پاس فوج تھی، ٹینک تھے اور ہوائی جہاز بھی تھے۔ ولایت کا سفید دیوتا اپنے کالے پجاریوں سے، اپنے بدترین مقاصد کو، بہترین الفاظ میں چھپانے کے ڈھنگ سیکھ چکا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے غالباً دنیا کی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بھی اعلان کیا کہ جب کشمیر کے حالات پر امن ہو جائیں گے تو الحاق کے بارے میں کشمیر کے عوام سے استصوابِ رائے کیا جائے گا.............لیکن یہ حقیقت بھی ماؤنٹ بیٹن سے زیادہ کسی پر واضح نہ تھی کہ ڈوگرے، سکھ اور سیوا سنگھی، ہندوستانی افواج کے ٹینکوں، توپوں اور طیاروں کی مدد سے استصواب رائے کے سلسلہ میں ہندوستان کی پریشانیاں دور کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

مردے ووٹ نہیں دیا کرتے۔



سلیم کئی ہفتوں سے لاپتہ تھا۔ لاہور سے اس کی روانگی کے بعد عصمت نے امینہ کو خط لکھ کر اس کی خیریت دریافت کی اور امینہ نے جواب میں لکھا کہ سلیم نے یہاں پہنچنے سے تین دن بعد اخبار میں اپنے کسی دوست کے متعلق یہ اعلان پڑھا کہ وہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے قصور میں اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں پہنچ چکا ہے۔ اگلے دن وہ میرے اصرار کے باوجود قصور چلا گیا۔ پندرہ دن بعد ارشد کو سلیم کا مکتوب ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں قصور کے کیمپ میں رضا کاروں کے ساتھ کام کر رہا

ہوں۔ یہاں مجھے اپنے ماموں کے گاؤں کے چند آدمی ملے ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ماموں جان اپنے خاندان کے ساتھ بہاولپور پہنچ گئے ہیں۔اس لیے میں اب وہاں جارہاہوں۔انشاءاللہ وہاں سے سیدھالاہور آؤں گا۔

اس کے بعد کئی دن تک سلیم کا کوئی خط نہیں آیا اور عصمت کی پریشانی تشویش میں تبدیل ہونے لگی۔ڈاکٹر شوکت اس کا مغموم چہرہ دیکھتا اور ہر بار اسے یہ کہہ کر تسلی دیتا۔''بیٹی! مہاجرین کے کیمپوں کی بری حالت ہے۔ان حالات میں سلیم جیسے آدمی کو کیسے چین آ سکتا ہے۔وہ بہاولپور کے کیمپوں میں کام کر رہا ہوگا۔ایسے آدمیوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔''

عصمت کبھی کبھی زخمی اور مریض عورتوں اور بچوں کی تیمارداری کے لیے اپنے باپ کے ساتھ کیمپ میں جایا کرتی تھی۔آہستہ آہستہ اس کام میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور اس نے باقاعدہ کیمپ میں کام کرنا شروع کر دیا۔

کیمپوں میں ہیضے کی روک تھام اور زخمیوں کی مرہم پٹی کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر چکا تھا اور کام کی وسعت کے مقابلے میں سند یافتہ ڈاکٹروں کی کمی کے باعث تھوڑا بہت طبی علم رکھنے والے رضا کاروں کو بھی غنیمت سمجھا جاتا تھا۔

جہادِ کشمیر شروع ہونے کے چند دن بعد ارشد لاہور سے تبدیل ہو کر راولپنڈی چلا گیا۔رخصت کے وقت عصمت نے جھجکتے ہوئے اس سے کہا۔''بھائی جان! مجھے یقین ہے کہ وہ کشمیر چلے گئے ہیں۔شاید راولپنڈی سے آپ کو ان کا پتہ مل جائے۔''

ارشد نے کہا۔''عصمت، میں کئی دن سے سوچ رہا تھا۔اگر سلیم وہاں ہے تو

راولپنڈی سے اس کا پتہ لگانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ میں انشاء اللہ تمھیں بہت جلد اطلاع دوں گا۔"

عصمت نے ہچکچاتے ہوئے کہا "بھائی جان.........!"

"کہو عصمت! کیا بات ہے؟"

"بھائی جان! میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

ارشد نے کہا۔ "بہت اچھا عصمت! میں راولپنڈی پہنچنے کے بعد تمھیں خط لکھوں گا۔"

ایک روز عصمت دن بھر کیمپ میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچی تو راحت اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ "آپا جان! آپا جان! بھائی سلیم کا خط آیا ہے۔ وہ کشمیر میں ہیں۔" راحت بھاگ کر اپنے کمرے سے خط لے آئی۔

ایک ثانیہ کے لیے عصمت بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکیں خاموش تھیں۔ کائنات پر ایک سکوت طاری ہو چکا تھا۔ اس کا ایک پاؤں نیچے اور ایک پاؤں برآمدے کی سیڑھی پر تھا۔ "ان کا خط؟" اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی۔ "سلیم کا خط؟" اس کی خاموش کائنات کے ہر ذرے سے نغمے پھوٹنے لگے۔ وہ فضا میں نغموں کی ہلکی ہلکی گونج سننے لگی.............درخت جھوم رہے تھے۔ پھول کھل رہے تھے۔ کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینیوں سے لبریز تھی.............. "سلیم کا خط؟" وقت کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں میں پھر ایک بار ربط پیدا ہو رہا تھا

............وہ خط لے کر برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی ....راحت کہہ رہی تھی

''آپا جان! میں نے ایڈریس سے ان کی تحریر پہچان کر آپ کی اجازت کے بغیر لفافہ کھول لیا تھا۔''

''راحت تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہ تھی۔'' یہ کہتے ہوئے عصمت خط پڑھنے میں منہمک ہوگئی۔ سلیم نے لکھا تھا:

''میری عصمت!

میں تمہیں کشمیر کے محاذ سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں قصور سے ملتان جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کشمیر پر ہندوستان کے حملے کی خبر آئی اور میں نے جہاد میں حصہ لینے کی نیت سے ملتان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کشمیر جانے سے پہلے لاہور پہنچ کر ایک دن تمہارے ہاں قیام کروں لیکن لاہور کے پلیٹ فارم پر مجھے آفتاب مل گیا .... آفتاب میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ تیس رضا کاروں کے سالار کی حیثیت میں کشمیر جا رہا تھا اور ان رضا کاروں میں پانچ نوجوان میرے ہم جماعت تھے۔ لوگ ان مجاہدوں کے گلے میں ہار ڈال رہے تھے۔

آفتاب اور باقی دوست میرے گرد جمع ہو گئے۔ آفتاب نے پوچھا۔ تم کہاں جا رہے ہو سلیم؟ اور میں نے جواب دیا کہ میری منزل

بھی وہی ہے، اور آفتاب نے اپنے گلے سے ہار اتار کر میرے گلے میں ڈال دیے اور اس کی دیکھا دیکھی چند اور آدمیوں نے بھی میرے گلے میں ہار ڈال دیے۔ جب گاڑی چلنے میں دس منٹ تھے، وہ ڈبے میں بیٹھ گئے۔ میں کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ میں آفتاب سے کہنا چاہتا تھا کہ اگلے دن راولپنڈی میں ان سے آن ملوں گا لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔ "آفتاب نے کہا۔ "اندر آجاؤ سلیم! گاڑی چلنے والی ہے۔" اور میں تذبذب کی حالت میں ایک پاؤں پائیدان پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے غازیانِ کشمیر زندہ باد نعرے لگا رہے تھے۔ ایک برقعہ پوش خاتون آگے بڑھی اور اس نے میرے گلے میں ہار ڈال دیا۔ پھر ایک عمر رسیدہ بزرگ نے آگے بڑھ کر کہا۔ "غازیوں کی فتح کی دعا مانگو۔" لوگوں نے ہاتھ اٹھائے اور میں نے بھی ہاتھ اٹھائے۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اور میں آفتاب کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اب میں کشمیر میں ہوں۔ میرا مقام یہی تھا۔ مشرقی پنجاب میں جو کچھ میں نے سیکھا تھا، وہ میرے کام آ رہا ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے میں آزاد کشمیر کی فوج کے ان چھاپہ مار دستوں کے ساتھ تھا جو ہندوستانی فوج کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ ان دستوں میں زیادہ تعداد سرحدی قبائل کے مجاہدین کی تھی۔ ہمارا سپہ سالار محسود قبیلے کا ایک نوجوان تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری قوم میں زندگی ہے۔ یہ

لوگ سینے پر گولی کھا کر مسکراتے ہیں۔ یہ موت کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ یہ دشمن کی توپوں اور ہوائی جہازوں سے مرعوب نہیں ہوتے .... برفانی پہاڑوں میں خون منجمد کر دینے والی سرد ہوائیں انہیں پریشان نہیں کرتیں۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کے پاس دیسی رائفلیں تھیں اور بعض دشمن کے ہاتھوں سے رائفلیں چھین لینے کی امید میں صرف چاقو اور چھرے لے کر چلے آئے تھے۔

ایک دن پچاس مجاہدوں کا ایک نیا گروہ ہمارے پاس پہنچا۔ یہ سلیمان خیل پٹھان تھے۔ جو پنجاب کے شہروں میں محنت مزدوری سے پیٹ پالا کرتے تھے۔ اب یہ لوگ جہادِ کشمیر میں حصہ لینے کے لیے آئے تھے۔ ان میں سے بعض کے پاس چاقو تھے اور بعض کے پاس وہ بھی نہ تھے۔ میں نے ایک نوجوان سے جو ان کا لیڈر تھا، سوال کیا۔ ''بھائی! رائفلوں کے بغیر تم کیا کرو گے؟'' اس نے کہا۔ ''تم پروا نہیں کرو۔ اگر ہمارے پاس ہتھیار نہیں تو دشمن کے پاس بہت ہے۔'' رات کو انہوں نے ہمارے سالار سے بیس رائفلیں ادھار لیں اور پندرہ میل دور ایک ہندوستانی چوکی پر حملہ کر دیا۔ علی الصباح جب وہ واپس آئے تو ان کے پاس اسی رائفلیں اور تین مشین گنیں اور بارود اور سامانِ رسد سے لدے ہوئے دس خچر تھے۔ اس مہم میں ان مجاہدوں میں سے بارہ شہید ہو چکے تھے۔ اگلے دن جب ہم نے وہاں جا کر

دیکھا تو سکھوں اور ڈوگروں کی ساٹھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن پٹیل اور نہرو کے سپاہی جس قدر بزدل ہیں، اسی قدر ظالم ہیں۔ چوکی سے جو سکھ اور ڈوگرے جانیں بچا کر بھاگے تھے، انہوں نے جاتے جاتے تین میل دور مسلمانوں کی ایک بستی کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

قبائلی مجاہدین دنیا کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے انہوں نے رائفلوں سے ہندوستان کے تین ہوائی جہاز گرائے تھے......... دوسرے محاذوں پر بھی وہ ہندوستان کے کئی طیارے گرا چکے ہیں اور اب یہ حالت ہے کہ ہندوستانی ہوا باز ہمارے فوجی ٹھکانوں کی بجائے صرف دیہات اور شہروں پر حملہ کرتے ہیں۔

میں مجاہدوں کے ساتھ بہت خوش تھا۔ ان کے درمیان مجھے کبھی اپنی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں خطرناک سے خطرناک مہم پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ ہمارا کام ہندوستانی فوج کے رسد و کمک کے راستوں کو کاٹنا اور دشمن کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنی طرف متوجہ رکھنا تھا۔ ہمارا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ اگر دشمن کے کنوائے کی آمد کی خبر ملتی تو ہم کسی گھاٹی میں چھپ کر اچانک اس پر حملہ کر دیتے۔ اگر فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملتی تو ہمیں راستے کے پلوں کو اڑانے کے لیے جانا پڑتا۔ ان حالات میں اگر میں نے تمہیں خط نہیں لکھا تو تمہیں شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

اب میں ایک اہم چوکی کی حفاظت پر متعین ہوں۔ یہ چوکی نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہاں ہندوستانی فوج کی توپیں اور مشین گنیں نصب تھیں۔ جنوری کے آخری ہفتے میں ہمیں جنرل طارق کا حکم آیا تھا کہ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر اس چوکی پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اس مہم کی قیادت کے لیے انہوں نے ایک کیپٹن کو بھیج دیا تھا۔ یہ کیپٹن ضلع میانوالی کا ایک سابق فوجی تھا۔ جو برما اور ملایا کے محاذوں پر لڑ چکا تھا۔ کیپٹن نے ہم سے کہا کہ اس مہم کے لیے مجھے چالیس ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو فتح سے زیادہ شہادت کی تمنا رکھتے ہوں۔

بہت سے آدمیوں نے اپنے نام پیش کیے لیکن کپتان نے صرف چالیس آدمیوں کو منتخب کیا اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ ہم نے برف کے طوفان میں رات کے دو بجے اس چوکی پر حملہ کیا لیکن دشمن غافل نہ تھا ہم پہاڑ کی چوٹی سے ایک ہزار فٹ نیچے تھے کہ دشمن نے گولہ باری شروع کر دی۔ پانچ بجے تک ہم رینگتے ہوئے چوٹی کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن اس دوران میں ہمارے پندرہ ساتھی شہید ہو چکے تھے، چھ بجے کے قریب ہم ان کی تین توپوں اور دو مشین گنوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ دوسری مشین گن پر دستی بم پھینکنے کے بعد ہمارا کپتان گر پڑا اور ہمیں معلوم ہوا کہ وہ تین گولیاں کھا چکا ہے۔ ہم نے ابھی دم نہیں لیا تھا کہ پہاڑی کی اگلی چوٹی سے، جو اس چوکی سے کوئی سو فٹ

بلند تھی۔ مشین گن اور مارٹر کے فائر ہونے لگے اور ہمارے سات اور ساتھی شہید ہو گئے.........دم توڑتا ہوا کپتان چلایا: "اگر تم نے سورج کی روشنی سے پہلے اس چوٹی پر قبضہ نہ کیا تو ہماری قربانی رائیگاں جائے گی۔" ہم نے تین اطراف سے اس چوٹی پر چڑھنا شروع کیا۔ میرے آگے ایک آفریدی مجاہد تھا۔ اس نے چوٹی پر پہنچتے ہی بھاگ کر مشین گن کے مورچے پر دستی بم پھینکنے کی کوشش کی لیکن گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور وہ گر پڑا۔ دوسری طرف سے ہمارے دو اور ساتھی اوپر پہنچ گئے اور پتھروں کی آڑ میں لیٹ کر فائر کرنے لگے۔ جب دشمن مشن گن کا رخ اس طرف پھیر رہا تھا، میں نے آگے بڑھ کر دستی بم پھینک دیا.........چوٹی پر قبضہ کرنے کے بعد میں بھاگتا ہوا نیچے پہنچا اور کپتان کو بتایا کہ ہم نے چوٹی پر قبضہ کر لیا ہے۔ کپتان نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تمہیں ہر قیمت پر اس چوٹی کی حفاظت کرنی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا.........دس منٹ بعد یہ مجاہد آخری سانس لے چکا تھا۔ اس چوکی سے ہمیں چار وہ بدنصیب لڑکیاں ملیں جنہیں نہرو کے سپاہی وادی کشمیر سے اٹھا لائے تھے۔ ان کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے پانچ اور لڑکیاں وہاں لائی گئی تھیں۔ تین سکھوں اور ڈوگروں کی درندگی کا شکار ہوئیں اور دو نے پہاڑی پر سے کود کر

جان دے دی۔ ان کی لاشیں برف میں دفن تھیں۔ یہ اس فوج کے سپاہیوں کا معمولی کارنامہ ہے۔ جسے ماؤنٹ بیٹن، گاندھی، نہرو اور پٹیل نے کشمیر کے عوام کے جان و مال، عزت اور آزادی کی حفاظت کے لیے بھیجا ہے۔

تیسرے دن اس محاذ پر آزاد کشمیر کی فوج کو ایک بہت بڑی فتح حاصل ہوئی۔ جنرل طارق بذاتِ خود اس حملے کی قیادت کر رہے تھے۔ فتح کے بعد وہ ہماری چوکی کا معائنہ کرنے آئے اور مجھے ایک غیر معین عرصے کے لیے اس چوکی کی حفاظت پر متعین کر کے چلے گئے۔

اب میں یہاں ہوں۔ برف باری زوروں پر ہے۔ موسمِ بہار سے پہلے اس جگہ دشمن کا ہوائی جہاز آجاتا ہے اور آس پاس اندھا دھند بم پھینک کر چلا جاتا ہے۔ آج تک جو بم اس چوکی سے نزدیک ترین گرا ہے وہ ہم سے دو فرلانگ دور ہے۔ ہم ایک ہوائی جہاز گرا چکے ہیں۔

پہلے جب میں گوریلا دستوں کے ساتھ تھا تو مجھے خط لکھنے کی فرصت نہ تھی۔ اب مجھے وقت ملتا ہے تو خط لکھ کر بھیجنے کی کوئی صورت نہیں۔ آج ہمارے پاس چند سپاہی رسد لے کر پہنچے ہیں اور میں یہ مکتوب ان کے حوالے کر رہا ہوں۔ میرے پاس تمہارا خط پہنچنے کی سردست کوئی صورت نہیں۔ تم آزاد کشمیر ریڈیو کی معرفت اپنے گھر کی خیریت کی اطلاع دے سکتی ہو۔ ہندوستان سپاہی ہماری چوکی میں

ایک بیٹری سیٹ ریڈیو بھی چھوڑ گئے ہیں اور ہم ہر شام خبریں اور فوجی پروگرام سنا کرتے ہیں۔

فرصت کے لمحات گزارنے کے لیے میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مضمون ایک چھوٹی سی کتاب بن جائے۔ ''اے قوم!'' اس مضمون کا عنوان ہے۔ لاہور سے آتے ہوئے گاڑی پر آفتاب نے میری زبانی مشرقی پنجاب کے واقعات سننے کے بعد اس بات پر زور دیا تھا کہ میں قوم کے نام ایک پیغام لکھوں۔ آفتاب نے اس مضمون کو چھپوا کر مفت تقسیم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ انشاءاللہ یہ چھوٹی سی کتاب بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔

خط بہت طویل ہو گیا ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا لیکن سپاہی جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

عصمت! ہندوستان کا ہاتھی کشمیر کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔ دُعا کیا کرو کہ میں تمہارے پاس فتح کی خوش خبری لے کر آؤں۔

تمہارا سلیم''۔



مشرقی پنجاب اور ہندوستان میں شامل ہونے والی ریاستوں میں مسلمانوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ بھارت سے اسی لاکھ انسان ہجرت کر کے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اب گاندھی مہاراج دہلی میں بیٹھ کر عدم تشدد کا درس دے رہے تھے اور ان کے چیلے باقی ہندوستان میں مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام سنا رہے تھے۔

جونا گڑھ پاکستان میں شامل ہو چکا تھا۔ وہاں کا حکمران مسلمان تھا لیکن رعایا کی اکثریت ہندو تھی، اس لیے وہاں ہندوستانی فوج بھیج دی گئی۔ کشمیر کی نوے فیصدی رعایا مسلمان تھی لیکن راجہ ہندو تھا، اس لیے وہاں بھی ہندوستان کی فوج بھیج دی گئی .... ہندوستان کے حکمران بھی ہندو تھے، اکثریت بھی ان کی تھی، اس لیے وہاں مسلم اقلیت کا مسئلہ اکالی سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کو سونپ دیا گیا تھا۔

پٹیل کے منہ سے آگ برس رہی تھی۔ وہ ایک دن کسی شہر میں تقریر کرتا اور اگلے دن خبر آ جاتی کہ وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا ہے۔ جواہر لال نہرو کشمیر میں اپنی افواج کے شاندار کارناموں پر فخر کر رہا تھا اور گاندھی جی دنیا کو عدم تشدد کی راگنی سنا رہے تھے۔ ایک ہی ساز سے کئی سر نکل رہے تھے۔ دیش بھگت گاندھی کی پوجا کرتے تھے۔ نہرو کی عزت کرتے تھے اور پٹیل کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو امن کے لیے گاندھی کی اپیلیں، فساد کے لیے پٹیل کی تقریریں اور جنگ کے سلسلے میں مہا منتری نہرو اور رکھشا منتری بلدیو سنگھ کے بیانات نشر کرتا تھا۔

گاندھی جی ابھی تک ہندو فاشزم کے جارحانہ مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر

رہے تھے۔انہیں دنیا کی رائے عامہ کے سامنے ننگا ہونا پسند نہ تھا۔وہ دیکھ رہے تھے کہ کشمیر کی جنگ میں نہرو کا پروگرام اب دنوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینوں میں تبدیل ہو رہا ہے۔گاندھی نے سرحد کے شیروں کو پہلے چرخے کے منتر سے رام کیا تھا،اس کے بعد جب چرخے کا طلسم ٹوٹا تو واردھا کے سامری نے پاکستان میں نسلیت کا بت کھڑا کرنے کی کوشش کی۔سرحد میں ان کے چیلے نے پٹھانستان کا نعرہ لگایا اور چند دنوں میں یہ نعرہ ایک خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا۔گاندھی کے ''مسلمان'' چیلے جو اکھنڈ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی غلامی کا طوق پہننے کے لیے بیقرار تھے،اب پٹھانوں کو پاکستان سے علیحدگی کا مشورہ دے رہے تھے۔طوفان سے پہلے ''آزاد خیال'' انسانوں کا یہ گروہ دس کروڑ مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے رسے سے باندھ کر ہندو فاشزم کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا اور طوفان کے بعد یہ لوگ پاکستان کی چٹان کو نسلیت کے تیشوں سے پاش پاش کرنے کی فکر میں تھے۔

لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہوئی۔کشمیر کی جنگ کفر و اسلام کی جنگ میں تبدیل ہو گئی اور جب اسلام کی تلوار بے نیام ہوتی ہے تو سب سے پہلے نسلیت کے بت توڑتی ہے۔واردھا کے سامری کا نیا بت کشمیر کی اس شاہراہ میں روندا گیا جہاں سرحدی قبائل،پنجابی،بلوچستانی اور سندھی مجاہدین ایک دوسرے سے کندھا ملائے آگے بڑھ رہے تھے۔

مہاتما گاندھی جنہوں نے ساری عمر ہندوؤں کو متحد کرنے اور مسلمانوں میں انتشار ڈالنے کے لیے جدوجہد کی تھی،اس صورتِ حالات سے پریشان تھے۔وہ

کشمیر میں فوجی اقدام سے پہلے پاکستان میں پٹھان اور غیر پٹھان کی تفریق ضروری سمجھتے تھے لیکن چیلوں کی جلد بازی نے ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ ڈالا تھا۔ اب پٹھان کشمیر کی جنگ میں پیش پیش تھا۔ اب عالمِ اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اب کشمیر کے تعلق وہ مقاصد ننگے ہو رہے تھے جن کی تکمیل کے لیے دہلی سے لے کر گورداسپور تک مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی گئی تھیں۔

گاندھی جی زہر آلود خنجر پھولوں کی ٹوکری میں چھپانے کے قائل تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے چیلوں کا جوش و خروش اور ان کی جنگ جویانہ تقریریں مسلمانوں کی قوتِ مدافعت کو بیدار کر رہی ہیں، اس لیے وہ قاتلوں کے منہ سے بھی ٹھنڈے اور میٹھے الفاظ سننا چاہتے تھے۔ انہیں سانپ کے ڈسنے کا ملال نہ تھا لیکن سانپ کا پھنکارنا پسند نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پھنکارنے والا سانپ بالآخر مارا جاتا ہے۔ چنانچہ مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں مسلمانوں کی مکمل تباہی اور دہلی سے لاکھوں مسلمانوں کی ہجرت کے بعد وہ برلا مندر میں امن شانتی اور عدمِ تشدد کا درس دے رہے تھے۔

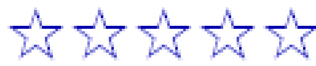
انہوں نے دنیا کی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے مرن برت بھی رکھا تھا لیکن ہندو قوم کے وہ تخریبی عناصر جنہیں گزشتہ برسوں میں اسلام دشمنی کے محاذ پر متحد اور منظم کیا گیا تھا، جنہوں نے پندرہ اگست کے بعد پوری آزادی کے ساتھ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، اب کسی ظاہری یا رسمی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ایک دن خبر آئی کہ کسی سیوک سنگھ نے مہاتما جی کو

بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

ایک سپیرے نے ایک خوفناک اژدہا پالا تھا۔ شہر کے لوگ اس کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے سپیرا اژدہا کو شہر کے چوراہوں میں لے جاتا اور اپنی ٹانگیں اژدہا کے منہ میں ڈال کر لوگوں سے کہتا۔ ''تم یونہی اس سے خوف کھاتے ہو۔ دیکھو وہ مجھے کچھ نہیں کہتا، میں اسے رام کر چکا ہوں، میں اس کی فطرت بدل چکا ہوں۔''

آہستہ آہستہ لوگوں کا خوف جاتا رہا۔ اس کے بعد سپیرا رات کے وقت اژدہے کو کھلا چھوڑ دیتا اور وہ جھونپڑی کے آس پاس بھولے بھٹکے مسافروں کو نگلنے کے بعد واپس آجاتا۔ اژدہے کی جرأت بڑھتی گئی اور وہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں میں گھس کر بھی اپنا شکار مار لیتا تھا۔ بالآخر شہر کے لوگوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے سپیرے سے شکایت کی۔ رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے سپیرے نے پھر ایک بار تماشائیوں کے سامنے اپنے ٹانگیں اژدہا کے منہ میں ڈال دیں لیکن اژدہا اب انسان کے گوشت اور خون کا ذائقہ چکھ چکا تھا اور سپیرے کا گوشت دوسرے انسانوں سے مختلف نہ تھا، وہ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے سپیرے کو نگل گیا۔

مہاتما گاندھی کا انجام اس سپیرے سے مختلف نہ تھا۔ گاندھی جی وحشت اور بربریت کے سیلاب کے بند ٹوٹ جانے کے بعد سرکش لہروں کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں ضبط و نظم کی تعلیم دے رہے تھے۔ ایک لہر آئی اور انہیں بھی اپنے ساتھ بہا لے گئی۔



موسم بہار کی ایک صبح عصمت اور راحت راولپنڈی میں سڑک کے کنارے ایک مکان کے پھاٹک میں کھڑی کشمیر جانے والے مجاہدین کو دیکھ رہی تھیں ۔ لوگ سڑک کے کنارے اللہ اکبر اور مجاہدین کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے ۔ یہ لوگ مختلف مقامات سے کشمیر، پاکستان اور عالمِ اسلام کی طرف سے پٹیل او رنہرو کو جواب دینے آئے تھے ، یہ لوگ اپنی دیسی رائفلوں سے دشمن کے ٹینکوں، طیاروں اور توپوں کا مقابلہ کرنے آئے تھے ۔ عصمت اور راحت ان بجلیوں کو دیکھ رہی تھیں جنہیں مشرقی پنجاب کی راکھ نے جنم دیا تھا۔

مجاہدین کا لشکر گزر گیا اور عصمت آبدیدہ ہو کر کہہ رہی تھی ۔ ''میرے بھائیو! بڑھے چلو ۔ خدا تمہیں محمود غزنوی کا عزم اور محمد بن قاسم کی غیرت عطا کرے ۔ تمہیں کشمیر میں بیگناہوں کا خون پکار رہا ہے ۔ تمہیں مشرقی پنجاب کی مساجد بلا رہی ہیں ۔ تمہیں لال قلعے کی دیواریں یاد کر رہی ہیں ۔ میری قوم کے بیٹو! تمہیں قوم بیٹیوں کی لٹی ہوئی عصمت کا واسطہ بڑھے چلو!''

ایک تانگہ مکان کے سامنے رکا اور ڈاکٹر شوکت اتر کر چمڑے کا ایک بیگ لیے پھاٹک کی طرف بڑھے ۔

''ابا جان! ابا جان!'' راحت اور عصمت نے یک زبان ہو کر کہا ۔

ڈاکٹر شوکت صحن میں داخل ہوئے ۔ راحت نے ان کے ہاتھ سے بیگ پکڑ لیا اور قدرے حیران ہو کر کہا ''ابا جان! یہ بہت بھاری ہے ۔ کیا ہے اس میں؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''بیٹی! میں اس میں تمہاری بہن کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔''

عصمت نے کہا۔ ''کیا ہے ابا جان؟''

''ٹھہرو آپا جان! میں کھولتی ہوں۔'' راحت یہ کہتے ہوئے بیگ زمین پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ بیگ میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک کتاب نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو سب کتابیں ہیں!''

کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں ''اے قوم!'' لکھا ہوا تھا۔ عصمت نے دیکھتے ہی راحت کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''سلیم کا ایک دوست لاہور میں یہ کتابیں چھپوانے کے لیے آیا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ مجھے پچاس جلدیں دے گیا تھا۔ کچھ میں نے تقسیم کر دی ہیں اور باقی تمہارے لیے لے آیا ہوں، انہیں تقسیم کر دو۔ پچھلے ہفتے سلیم کا خط آیا تھا، وہ میں نے تمہیں بھیج دیا تھا۔''

''جی ہاں! وہ مجھے مل گیا ہے۔''

''ارشد کہاں ہے؟''

''جی! وہ آج بہت سویرے ہسپتال چلے گئے تھے۔''

راحت نے کہا۔ ''ابا جان! چلیں اندر بیٹھیں۔''

''نہیں بیٹی! میں اب جا رہا ہوں۔''

''کہاں ابا جان؟'' عصمت نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''بیٹی! میں پانچ ڈاکٹروں کے ساتھ کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہوں۔ لاہور کے چند

تاجروں نے ہمیں دو ایمبولینس گاڑیاں اور دس ہزار روپے کی دوائیں خرید کر دی ہیں۔ہمیں شام سے پہلے روانہ ہونا ہے۔میرے ساتھی سٹیشن کے قریب میرا انتظار کر رہے ہیں۔میں سمجھتا تھا کہ اب میں کسی بڑی خدمت کے قابل نہیں رہا لیکن سلیم کی اس تحریر نے مجھے پھر جوان بنا دیا ہے۔میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔‘‘

ڈاکٹر شوکت انہیں خدا حافظ کہہ کر دوبارہ تانگے میں بیٹھ گئے۔

عصمت کتاب کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی کمرے میں پہنچ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور شروع سے پڑھنے لگی۔دوسرے کمرے میں راحت ذرا بلند آواز سے پڑھ رہی تھی۔عصمت نے اسے آواز دی ’’راحت! آہستہ پڑھو۔‘‘

راحت چند منٹ خاموش رہی لیکن پھر اسی طرح بلند آواز میں پڑھنے لگی۔عصمت نے اسے پھر ٹوکا۔راحت نے کمرے سے ایک کرسی اٹھائی اور صحن میں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں پندرہ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے واقعات پر تبصرہ تھا۔دوسرے حصے میں مصنف نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کے چشم دید حالات بیان کیے تھے اور آخری حصے میں قوم کے نام سلیم کا پیغام تھا۔وہ پیغام یہ تھا:

’’اے قوم! تو نے تاریخِ انسانی کا سب سے تاریک دور دیکھا ہے۔دنیا میں ظالم اور مظلوم کی داستان بہت پرانی ہے۔انسانیت کے خرمن پر کئی بجلیاں گری ہیں۔باغِ آدم میں کئی آندھیاں آئی ہیں۔وحشت اور بربریت کے ہاتھوں نے

بار ہا انسانیت کا منہ نوچا ہے۔لیکن آگ اور خون کا جو کھیل تو نے دیکھا ہے، وہ کسی اور نے نہیں دیکھا۔

تیرا ادیب اور تیرا شاعر تجھے دلکش افسانے اور میٹھے راگ سنانے کے لیے آیا تھا .... لیکن تو خاک اور خون میں لوٹ رہی تھی۔ وہ تیری محفل میں کلیوں کی مسکراہٹوں اور قمریوں کے ترانوں کا طلب گار تھا لیکن اس کے سامنے خون کی ندیاں، راکھ کے انبار اور لاشوں کے ڈھیر تھے وہ تیرے قدموں پر ستاروں کی مسکراہٹیں، قوسِ قزح کے رنگ اور روئے زمین کی تمام دلفریبیاں اور رعنائیاں نچھاور کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے لٹی ہوئی عصمتیں تھیں۔

اے قوم! میں تیرے لیے مشرقی پنجاب سے آگ کی چنگاریاں لے کر آیا ہوں جو تیرے بچوں کو جلا چکی ہے .... میں تیرے لیے ان کی پھٹی ہوئی قباؤں کے ٹکڑے لے کر آیا ہوں جو تیری بیٹیوں کی عصمت کے خون سے داغدار ہیں۔ میں تجھے دلکش نغمے نہیں بلکہ وہ جگر دوز چیخیں سنانے آیا ہوں جو اب تک دہلی اور مشرقی پنجاب کی فضاؤں میں گونج رہی ہیں۔ میں تیرے ساتھ آگ سے کھیل چکا ہوں۔ خون میں نہا چکا ہوں۔ میرا ماضی اور حال تیرے ماضی اور حال سے وابستہ ہے اور میرا مستقبل تیرے مستقبل سے جدا نہیں۔ تیرے لیے میرا پیغام اس ادیب اور شاعر کا پیغام نہیں جو اپنی محفل کی تاریکیوں سے گھبرا کر منہ پھیر لیتا ہے اور غیروں کے عشرت خانوں میں سکون تلاش کرتا ہے۔ میں تیرے ساتھ گرا ہوں اور تیرے ساتھ اٹھوں گا۔

میں تلخ حقائق پر تصورات کے حسین پردے نہیں ڈالوں گا۔ دہلی سے لے کر مشرقی پنجاب کے آخری کونے تک ہمارے شہر برباد کیے گئے، ہماری بستیاں تباہ کی گئیں۔ ہمارے گذر جلائے گئے۔ معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا، لاکھوں انسان قتل ہوئے، ہزاروں عورتیں چھینی گئیں، وہ زمین جس پر ہم نے آٹھ صدیاں سطوت اور اقبال کے پرچم لہرائے تھے، ہماری بے گوروکفن لاشیں دیکھ رہی تھی۔ وہ آسمان جس نے غازی محمد بن قاسم کی غیرت کے سامنے راجہ داہر کو سرنگوں دیکھا تھا، جس نے محمود غزنوی اور غوری کا جاہ وجلال دیکھا تھا، ہماری ذلت، رسوائی اور بے بسی کا تماشہ کررہا تھا۔ لیکن کیا یہ سب کچھ بلاوجہ تھا؟ کیا یہ اتفاقی حادثہ تھا؟

نہیں۔ یہ بلاوجہ نہ تھا۔ یہ اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ قانونِ قدرت میں اقوام کے عروج وزوال کی راہیں معین ہیں۔ عزت اور سربلندی ان کے لیے ہے جو فلاح وترقی کے راستوں میں گامزن ہوتے ہیں اور جو پستی کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ بالآخر ذلت کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں .... قانون قدرت میں کسی قوم کا اجتماعی عمل رائگاں نہیں جاتا .... مشرقی پنجاب کی تباہی اور بربادی ہماری اپنی کوتاہیوں، غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں کی سزا تھی۔ ہم نے بھیڑوں کی زندگی اختیار کی اور بھیڑیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ہماری کوتاہی اور خود فریبی کے باعث ایک ایسے دشمن کی تلوار ہماری شاہ رگ تک پہنچ چکی تھی جس کے مذہب اور اخلاق میں کمزور کے لیے رحم یا انصاف کی گنجائش نہ تھی۔ ہمارا دشمن وہ تھا جسے منوجی جیسے استادوں نے ملک گیری کے آداب سکھائے تھے .... ہمارا دشمن وہ تھا جس نے

دنیا میں سب سے پہلے سلیت کا بت کھڑا کیا تھا۔ جس نے کمزور انسانوں کو مغلوب کر کے اچھوت بنایا تھا اور ان کے خون اور ہڈیوں پر اپنے سماج کی بنیادیں کھڑی کی تھیں.......... صدیوں کے بعد انسانیت کا یہ دشمن ماضی کے کھنڈروں میں ایک نئے سماج کی بنیادیں کھود رہا تھا اور ان بنیادوں کو پر کرنے کے لیے اس نے مسلمان کا خون اور ہڈیاں منتخب کی تھیں ۔ ہندو کے نئے اتحاد اور تنظیم کی بنیاد اسلام دشمنی کے جذبہ پر رکھی گئی تھی۔ ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن ہم ماضی سے بے نیاز، حال سے غافل اور مستقبل سے بے پرواہ تھے۔

ہمیں مورچہ بنانے کی اس وقت فکر ہوئی جب دشمن گولہ باری شروع کر چکا تھا .... ہمیں بند لگانے کا اس وقت خیال آیا، جب سیلاب آ چکا تھا۔

ہم دن کے وقت سو رہے تھے، دشمن آیا، اس نے ہمیں رسیوں میں جکڑ دیا اور ہمارے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو گیا .... ہم بے بس تھے .... ہم مجبور تھے .... ہم احتجاج کر رہے تھے۔ ہم التجائیں کر رہے تھے۔ ہم نے دنیا کی رائے عامہ سے اپیلیں کیں۔ ہم غیر جانب دار مبصرین کو اپنی مظلومیت کا حال دیکھنے کی دعوت دے رہے تھے .... لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ جہاں جنگل کا قانون ہو، وہاں فقط شیر کی گرج سنی جاتی ہے، بھیڑ کی ممیاہٹ پر کوئی کان نہیں دھرتا۔

دردمندانِ قوم قراردادوں، احتجاجوں اور بیانوں کے نسخے آزما رہے تھے .... بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو انہوں نے احتجاج کیا۔ گڑھ مکھتیشر کی باری آئی تو انہوں نے سخت احتجاج کیا .... پنجاب کی ریاستوں اور

دہلی میں تباہی اور بربادی کا طوفان پھوٹ نکلا تو انہوں نے الفاظ کے تمام خزانے لٹا دیے .... احتجاج کرنے والوں کے گلے بیٹھ گئے، الفاظ کے ذخیرے ختم ہو گئے، لیکن تباہی اور بربادی کے طوفان کی رفتار کم نہ ہوئی۔

ہمارے پاس الفاظ کی کمی نہ تھی۔ ہمارے پاس بین الاقوامی شہرت کے مقرر تھے لیکن ٹریجیڈی یہ تھی کہ پاکستان کا اسلحہ ماؤنٹ بیٹن کے پاس امانت تھا۔ ٹریجیڈی یہ تھی کہ پاکستان کی افواج باہر تھیں اور سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ تھی کہ انگریز کی سیاست انسانیت کے سب سے بڑے دشمن کو دہلی کے تخت پر بٹھا چکی تھی۔"



اے قوم! ہم بددیانتی اور بے انصافی کا شکار ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری کمزوری اور بے بسی نے ہمیں ان عدالتوں کے فیصلوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا جن سے عدل و انصاف کی امید رکھنا ایک خودفریبی تھا۔

ہم نے کفر کو اسلام کا دوست سمجھ کر صدیوں کے تاریخی حقائق کو جھٹلایا تھا۔ ماضی کی تاریخ شاہد ہے کہ غیر اسلامی نظام میں عدل و انصاف کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں نے ہمیشہ مظلوم کے آنسوؤں سے ظالم کے قہقہوں کا سامان مہیا کیا ہے۔ عدل و انصاف صرف ان کے لیے ہے .... جو بے انصافیوں کے خلاف لڑنے کی ہمت رکھتے

ہیں۔

اے قوم! تیرے درد کا علاج بین المملکتی کانفرنسوں میں نہیں۔ تیرا دشمن حالات کے مطابق اپنا طریق کار بدلتا رہتا ہے لیکن اس کے مقاصد میں تبدیلی نہیں آتی............ وہ ہندوستان کی تقسیم پر رضامند نہ تھا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ ماؤنٹ بیٹن اس کی کشتی میں بیٹھ چکا ہے اور اس کا طریق کار بالآخر تقسیم کے حقیقی مقصد کو فوت کر دے گا تو اس نے تقسیم کا اصول مان لیا اور تو خوش ہو گئی کہ تجھے کسی قربانی کے بغیر پاکستان مل گیا ہے۔ دشمن نے اپنے ترکش کا نیا تیر نکالا اور دہلی سے مشرقی پنجاب کے آخری کونے تک قتل و غارت کا طوفان بپا کر دیا اور اس کے ساتھ ریڈ کلف ایوارڈ کا خنجر تیرے سینے میں گھونپ دیا گیا۔ تیرے سپاہی باہر تھے، تیرا اسلحہ ہندوستان میں روک لیا گیا تھا اور تیرے وہ ہاتھ جو مدافعت کے لیے اٹھ سکتے تھے، پہلے ہی باندھ دیے گئے تھے۔ ان حالات میں تیرے لیے تاریخ انسانی کی سب سے بڑی بے انصافی اور ظلم کے سامنے سر جھکا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور پھر تجھے امید تھی کہ یہ ریڈ کلف کا فیصلہ مان لینے کے بعد تیرا دشمن تیری امن پسندی اور نیک نیتی پر خوش ہو جائے گا۔ لیکن یہ ایک اور خود فریبی تھی۔ تو یہ سمجھتی تھی کہ مشرقی پنجاب کا طوفان وہیں رک جائے گا لیکن وہ طوفان دہلی میں پہنچ گیا اور پھر امن پسندوں کا ایک گروہ یہ کہہ کر اپنے

آپ کو تسلیاں دے رہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ یہ دونوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہو گا ....لیکن ہندوستان نے دوسرا قدم اٹھایا اور کشمیر پر حملہ کر دیا ....تو دنیا کی رائے عامہ کے سامنے دشمن کے ظلم و استبداد اور اپنی صلح جوئی اور امن پسندی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی کہ ہندوستان کی فوجیں جونا گڑھ میں داخل ہو گئیں۔

اے قوم! تیرے فرزانے دنیا کی رائے عامہ سے اپیلیں کر رہے تھے۔ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن امنِ عالم کے اجارہ دار خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر تیرے دیوانوں کو ہوش آیا۔ مظلومیت، بے بسی اور مجبوری کی انتہا دیکھنے کے بعد تیری ڈوبتی ہوئی نبضوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔ تیرے شاہین صفت جوانوں نے تیری پکار سنی۔ تیرے محمد بن قاسم، تیری بیٹیوں کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسوؤں کی تاب نہ لا سکے۔ ہندوستان میں سومنات کے نئے پجاریوں نے تیرے فرزندوں میں پھر ایک بار غزنوی کی روح بیدار کی ....اور کشمیر کی وادیوں میں تیرے شیروں کی گرج سنائی دینے لگی۔ تیرے فرزانے ابھی ساحل سے محوِ تماشا تھے کہ تیرے دیوانے بے خطر دریا میں کود پڑے اور موجوں سے کھیلتے ہوئے منجدھار تک جا پہنچے۔

نہرو کی افواج چھ دن کے اندر اندر مجاہدین کی قوت مدافعت کچل دینے کے عزائم سے میدان میں آئی تھیں لیکن وہ تلواریں جن کی تیزی مشرقی پنجاب میں نہتے اور بے بس انسانوں کی گردن پر آزمائی گئی تھی، کشمیر میں کند ثابت ہو رہی تھیں۔

پٹیل نہرو اور بلدیو ہر روز یہ اعلان کرتے تھے۔ ''شاباش بہادرو! بھارت ماتا کو تم پر فخر ہے''۔ لیکن بھارت ماتا کے قابل فخر بیٹے حیران تھے کہ ان کے سامنے نہتوں کو کیوں نہیں ڈالا گیا۔ ہندوستانی حکومت پاکستان سے شکایت کر رہی تھی کہ اس نے قبائلی اور سرحدی رضا کاروں کو سرحد پر کیوں نہیں روکا۔ کوٹلی میر پور اور اکھنور میں ہندوستانی فوج کے دانت کھٹے ہو چکے تھے۔ اوڑی اور پونچھ کے محاذوں پر ہندوستانی فوج اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے باوجود مار رکھا رہی تھی۔ مجاہدین کے بے سرو سامان فوج اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اسلحہ چھین چکی تھی۔ اقبال کی روح کشمیر کی وادیوں اور پہاڑیوں میں غازیوں کا خیر مقدم کر رہی تھی اور ہندوستان کے مہاجن بہی کھاتے کھول کر اپنے نقصانات کا اندازہ لگا رہے تھے۔

سرحدی عقاب جموں سے صرف چند میل دور تھے کشمیر کے طارق اور خالد پھر ایک بار اپنے اسلاف کی روایات زندہ کر رہے تھے۔ اب سنگینوں کے جواب میں احتجاج کی بجائے تلواریں تھیں۔ اب

ہندوستان یو این او کے سامنے فریاد کر رہا تھا۔

جب پاکستان کہتا تھا کہ کشمیر کا معاملہ بین الاقوامی عدالت کو سونپ دیا جائے تو ہندوستان پاکستان کی آواز پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن اب وہ سات سمندر پار جا کر یو این او کے سامنے فریاد کر رہا تھا .... بھیڑیئے کو یہ شکایت تھی کہ اسے مشرقی پنجاب، دہلی اور جونا گڑھ کی طرح کشمیر میں بھی بھارت ماتا کی آزادی کا جشن منانے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی .... بھیڑیوں کا نمائندہ امن عالم کے اجارہ داروں سے اپیل کر رہا تھا کہ تم پاکستان کو حکم دو کہ وہ آزاد کشمیر کی فوج کو ہماری شکارگاہ سے نکال دے۔ تم کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمانوں کو جکڑ کر ہمارے سامنے ڈال دو اور پھر ہمارے ہاتھ دیکھو۔

آج کشمیر کا مسئلہ سکیورٹی کونسل کے سامنے ہے۔ پاکستان کی وکالت اس کے بہترین دماغ کر رہے ہیں۔ ہندوستان دنیا کی رائے عامہ کے سامنے ننگا کھڑا ہے، لیکن ہمیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یو این او امن عالم کے اجارہ دار ہمارے ساتھ اسی صورت میں انصاف کریں گے، جب کہ ہم میں بے انصافیوں کے خلاف لڑنے کی ہمت اور طاقت ہوگی، آج اگر یو این او میں ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی آواز بھی سنی جا رہی ہے تو ہمیں ان مجاہدوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر دنیا کے سامنے کشمیر

کے مسئلے کی اہمیت واضح کر دی ہے، جنہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان جو بین الاقوامی دھڑے بندیوں کے باعث جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی رہنمائی کے خواب دیکھ رہا تھا، کشمیر کی دلدل میں پھنس چکا ہے .... لیکن ابھی کشمیر کی جنگ ختم نہیں ہوئی اور ہمیں اس خود فریبی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان نے کشمیر کے منصفانہ حل کے لیے بین الاقوامی انجمن کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ہندوستان نے مجبوری کی حالت میں فقط اپنا طریقِ کار بدلا ہے۔ گزشتہ نقصانات کے بعد اسے کشمیر پر فیصلہ کن حملے کے لئے تیاری کی ضرورت تھی .... کشمیر کی برف باری اور سردی نے اس کے سپاہیوں کے حوصلے ٹھنڈے کر دیئے تھے۔

سردیوں میں ہندوستانی فوج سامانِ رسد اور بارود کے ذخیرے جمع کر رہی تھی۔ نئے پل اور نئی سڑکیں تعمیر کر رہی تھی اور موسم بہار کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان اپنی پوری طاقت کے ساتھ نیا حملہ کر چکا ہے۔ جونا گڑھ کو ہڑپ کرنے کے بعد اسے یقین ہو چکا ہے کہ امنِ عالم کے اجارہ داران فیصلوں کو رد نہیں کر سکتے جو طاقت کے بل بوتے پر منوائے جاتے ہیں۔

پاکستان کو بالآخر کشمیر کی جنگ میں کودنا پڑے گا۔ مجاہدین کشمیر تیاری کے لیے جو تھوڑا بہت موقع دے رہے ہیں، پاکستان کو اس سے

فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی مظلومیت اور بے بسی کا ڈھنڈورا پیٹ کر یو این او کو کشمیر کے معاملہ میں عملی مداخلت پر مجبور کر دیں گے، انہیں فلسطین سے سبق حاصل کرنا چاہیے......... فلسطین میں امن عالم کے اجارہ داروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کمزور اقوام کو ان سے عدل و انصاف یا رحم کی امید نہیں رکھنی چاہیے......... عرب ممالک فلسطین پر یہود کی یلغار کے سامنے مضبوط محاذ بنا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکیورٹی کونسل نے بھی تقسیم فلسطین کی حمایت کی......... اینگلو امریکن بلاک کی یہود نوازی کے بعد دنیا کا خیال تھا کہ روس ان ناانصافی کی مخالفت کرے گا لیکن یہ پہلا فیصلہ تھا جس پر کیمونسٹ اور سرمایہ دار دونوں متفق تھے۔ ایک اجنبی قوم کو مسلمانوں کے گھروں میں لا کر بٹھا دیا گیا۔

فلسطین کے مسلمانوں کا جرم یہ نہ تھا کہ ان کی منطق کمزور تھی، جرم یہ تھا کہ وہ اپنے گھر کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان کے پاس وہ تلوار نہ تھی۔ جو غیر منصفانہ فیصلے کو رد کر سکتی۔

حالات اب پاکستان کو مفروضات کی دنیا میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کشمیر پر ہندوستان کے نئے حملے کی شدت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسے بھی جونا گڑھ کی طرح ایک فیصلہ شدہ امر بنا کر

دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے .... اور تلوار کا فیصلہ منطق سے
نہیں، صرف تلوار سے روکیا جا سکتا ہے .... مجاہدین نے اپنی بے
سروسامانی کے باوجود جس عزم و استقلال کا ثبوت دیا ہے، اس کی
مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر کی
جنگ پاکستان کی جنگ ہے۔ یہ صرف کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمانوں کا
نہیں بلکہ پوری قوم کی بقا کا مسئلہ ہے، یہ ہندوستان کے برصغیر میں کفر
اور اسلام کا آخری معرکہ ہے اس اجتماعی جنگ کی ذمہ داری صرف
کشمیر کے مٹھی بھر بے سروسامان مجاہدین پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہمیں
مجاہدوں کے بازو شل ہو جانے اور ان کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ
تک بہ جانے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ آزاد کشمیر کی رائفلیں ایک
لامتناہی عرصہ تک دشمن کے ٹینکوں اور طیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں
.... کشمیر پاکستان کی بیرونی فصیل ہے، اگر دشمن کی یلغار کو وہاں نہ
روکا گیا تو وہ کشمیر کو ختم کرنے کے بعد پاکستان پر حملہ کرنے سے دریغ
نہیں کرے گا۔"

ہندوستان نے دہلی اور مشرقی پنجاب سے لاکھوں مسلمانوں کو
ملک بدر کیا۔ تو وہ مغربی پاکستان آ گئے۔ بہار اور مغربی بنگال کے
مسلمان مشرقی پاکستان میں پناہ لے رہے ہیں۔ ہندوستان نے جونا
گڑھ پر چڑھائی کی تو وہاں سے مسلمانوں کے قافلے کراچی اور سندھ

پہنچنے لگے۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج داخل ہوئی تو کشمیری مہاجرین کے لیے مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں کیمپ کھل گئے ....

پاکستان مہاجرین کی جائے پناہ ہے، پاکستان انصار کا قلعہ ہے پاکستان وہ ساحل ہے۔ جہاں ہم خون کے دریا عبور کرنے کے بعد پہنچے ہیں۔ پاکستان وہ منزل ہے جس کے راستوں کو کھائیاں ہم نے اپنی لاشوں سے پاٹی ہیں .... پاکستان وہ چاردیواری ہے جس کے اندر قوم کی منتشر قوتیں جمع ہورہی ہیں اور پاکستان کے انصار اور مہاجرین کے لیے یہ سوچنے کیلئے بہت تھوڑا وقت ہے کہ اگر وہ کفر کے سیلاب کو اس چاردیواری سے دور نہ رکھ سکے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔

اب تلخ حقائق پر تصورات کے حسین پردے ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں اب قوم کا دل بہلانے کے لیے لیڈروں کا یہ نعرہ کافی نہیں کہ ہم نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست قائم کرلی ہے، بلکہ اب انہیں قوم کی آنکھیں کھولنی چاہئیں کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست انسانیت کے سب سے بڑے دشمن کا سامنا کررہی ہے۔ یہ اس قوم کی میراث ہے، جس کے اسلاف نے آٹھ صدیاں پشاور سے لے کر راس کماری تک اپنی سطوت اور اقبال کے پرچم لہرائے ہیں .... یہ دورِ زوال کی دو صدیوں میں رجعت قہقری کے بعد ہمارا آخری دفاعی مورچہ ہے .... یہ ہماری اجڑی ہوئی محفل کا آخری

چراغ ہے .... یہ ہمارے خزاں رسیدہ چمن کا آخری درخت ہے .... اور اب دشمن اس درخت کی جڑیں کاٹنے اور اس چراغ کو بجھانے کی فکر میں ہے .... ہم اپنی تاریخ کے بھیانک ترین حوادث کا سامنا کر رہے ہیں اور ان حوادث کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں دفاع پر مرکوز کر دیں۔ پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو اپنی بقا کی جنگ میں ایک متحدہ محاذ پر لانے کے لیے وہ تمام خامیاں دور کرنی پڑیں گی جو غریب کو امیر سے دور رکھتی ہیں۔ جو محنت کش اور سرمایہ دار کی متحدہ مساعی میں مانع ہیں۔ مرمریں ایوانوں اور جھونپڑوں میں رہنے والوں کو ایک ہی حس دق اور ایک ہی مورچے میں کھڑا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان طبقاتی اختلافات کو دور کریں جو اقتصادی وسائل کی غیر مساوی تقسیم کے باعث پیدا ہو چکے ہیں۔

اب ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے پیچھے ہٹنا ہمارے لیے تباہ کن ہوگا۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم محاصرے کی صورت میں ہیں اور اگر دشمن کو کشمیر پر قابض ہونے کی اجازت دی گئی تو یہ گھیرا اور تنگ ہو جائے گا۔ جو قوم صرف اپنے مورچے میں بیٹھ کر مدافعانہ طریق کار پر عمل کرتی ہے اور آگے بڑھ کر دشمن کے جارحانہ اقدام کو نہیں روکتی۔ ہمیشہ نقصان اٹھاتی ہے، جنگ میں صرف دشمن کا وار روکنے پر ہی اکتفا

نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی ہر ضرب کے جواب میں ضرب لگائی جاتی ہے۔

ہندو کانگرس کے ساتھ بقا کی جنگ میں گزشتہ چند برس سے ہمارا طریق کار یہ تھا کہ وہ ہر بار موقع ملنے پر وار کرتا رہا اور ہم روکنے پر اکتفا کرتے رہے۔ ہمارے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان ہماری پیش قدمی کا نقطۂ آغاز بننے کی بجائے ہماری پسپائی کا آخری نقطہ بن گیا............صلح اور امن کی خاطر ہم اتنا کچھ کھو کر بھی ہندو کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے، اور اب گزشتہ تجربات کے باوجود بھی اگر ہم خوش فہمیوں اور غلط اندیشوں کا شکار ہوئے تو ہماری حالت ان لوگوں سے مختلف نہ ہو گی جو دن کی روشنی میں بھی آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں اور اب ہمیں اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ ہندو اپنے ترکش سے نیا تیر نکال لے۔ بلکہ ہمیں اپنے ترکش کے تیروں کا جائزہ لینا چاہیے۔



''اے قوم! مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا، وہ فرقہ وارانہ فساد کا نتیجہ نہ تھا۔ تاریخ انسانی کے اس عظیم ترین قتلِ عام کے لیے فرقہ وارانہ فساد کا لفظ پروپیگنڈا کے فن کے ان استادوں کے دماغ کی اختراع

ہے، جنھوں نے دنیا کی نگاہوں کے سامنے اہنسا پرمودھرما کا نقاب
ڈال کر بدترین بھیڑیوں کی فوج تیار کی تھی۔ مشرقی پنجاب، دہلی،
بھرت پور، الور، پٹیالہ، فریدکوٹ، نابھہ اور کپورتھلا کے اسٹیج پر جو خونیں
ڈرامہ کھیلا گیا، اسے فرقہ وارانہ فساد سے کوئی نسبت نہ تھی۔

یہ وہ قتل عام تھا جس کی سرپرستی اور رہنمائی بھارت کی حکومت،
بھارت کی فوج اور پولیس اور بھارت میں شامل ہونے والی ریاستوں
کے حکمران کر رہے تھے۔ نہرو اور پٹیل سے لے کر ایک سیوا سنگھی اور
بلدیو سنگھ سے لے کر ایک اکالی رضا کار تک سب مسلمانوں کے قتل
عام میں شریک تھے .... یہ قتل عام ہندوستان سے مسلمانوں کے
مکمل استیصال کے منصوبے کی ایک کڑی تھی۔

لیکن پاکستان میں ابھی تک ایسے لوگ ہیں جو ہر حالت میں پٹیل
اور نہرو کی قباؤں سے خون کے داغ دھونا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ
اس قوم کو پھر ایک بار تھپکیاں دے کر سلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تقسیم سے پہلے جب کانگرس مسلمانوں پر آخری ضرب لگانے
کے لیے ہندو اور سکھ قوم کے تخریبی عناصر کو منظم کر رہی تھی تو غلط اندیش
لوگوں کا ایک گروہ مسلمانوں کو یہ کہہ کر لوریاں دیا کرتا تھا کہ ہندو مسلم
بھائی بھائی ہیں، مسلمانوں کو ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق شک نہیں
کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم رجعت پسندی ہے، تنگ نظری

ہے، گاندھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں ………… تقسیم کے بعد ان لوگوں کی جگہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ میدان میں آ گیا ہے۔ اب یہ لوگ ہندو فاشزم کی صفائی پیش کر رہے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ اول تو مشرقی پنجاب کے عبرت ناک واقعات کا ذکر نہ کیا جائے، اگر کیا بھی جائے تو پچاس فیصدی ذمہ داری ہندوؤں اور سکھوں پر ڈال دی جائے اور پچاس فیصدی مسلمانوں پر اور یہ اس لیے کہ مسلمان مشرقی پنجاب کے بھیانک واقعات سے عبرت حاصل کر کے ہندو فاشزم کے سیلاب کے مقابلہ میں اپنی اجتماعی قوت بروئے کار نہ لا سکیں۔ ہندوستان جونا گڑھ کو ہڑپ کر چکا ہے۔ کشمیر کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور ہندوستان سے مسلمانوں کے مکمل استیصال کے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد پاکستان پر آخری ضرب لگانا چاہتا ہے۔

ان ادیبوں اور شاعروں کے لیے مسلمان کی عزت اور آبرو، جان اور مال کا کوئی مسئلہ نہیں۔ دس پندرہ لاکھ انسانوں کا قتل بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ………… قوم کی ہزاروں چھینی ہوئی بہو بیٹیوں کا مسئلہ ان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سیاسی، روحانی اور اخلاقی یتیم ادب کے نام سے کوکین کی تجارت کرتے ہیں اور پاکستان کے بعض ادارے صرف ہندوستان میں چند کتابیں بیچنے کے لیے ان

کوکین فروشوں کی سرپرستی کررہے ہیں۔

اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اجتماعی جدوجہد، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ مشرقی پنجاب کی تباہی کے بعد پاکستانی مسلمان یہ محسوس کررہے ہیں کہ اگر ہم ہندو فاشزم کی یلغار کے سامنے اپنی اجتماعی قوت بروئے کار نہ لاسکے تو پاکستان کی سرزمین پر بھی مشرقی پنجاب، دہلی اور جوناگڑھ کی تاریخ دہرائی جائے گی............ اجتماعی خطرے کا احساس قوم کے نوجوانوں کو کشمیر کے میدان میں لے آیا ہے۔ یہاں وہ جنگ لڑی جارہی ہے جس پر کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمانوں کے علاوہ پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کی زندگی کا دارو مدار ہے، یہاں انسانیت اور عالم اسلام کے لیے سب سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا جارہا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ صرف اس خطۂ زمین کا مسئلہ نہیں جو جغرافیائی طور پر پاکستان کا حصہ ہے۔ جس کی وادیوں میں پاکستان کی زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں بلکہ یہ ایک پوری قوم کی بقاء آزادی اور عزت کا مسئلہ ہے۔ یہ آگ اور خون کے اس ڈرامے کا ایک سین ہے۔ جس کا آخری ایکٹ ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل پاکستان کے سٹیج پر کھیلنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں قوم کے سپاہی کی تلوار اور قوم کے ادیب کے قلم کا راستہ ایک ہے۔ متحدہ قومیت کے

مارفیا کا انجکشن دینے والے سیاست دانوں کی جماعت قوم کو اس وقت تھپکیاں دے کر سلایا کرتی تھی جب افق پر طوفان کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ لیکن کوکین فروش قسم کے ادیبوں اور شاعروں کی یہ جماعت طوفان کی تباہ کاریوں کے سامنے بھی قوم کی آنکھوں پر پٹی باندھ رہی ہے۔ ان کے سیاسی پیش رو اونگھتے ہوئے مسلمان کو خواب آور گولیاں کھلاتے تھے اور یہ جاگتے ہوئے مسلمان کے حلق میں کوکین ٹھونس رہے ہیں۔ ان کے لیے مسلمانوں کی آزادی کا مسئلہ نہ تھا اور اب ان کے اذہان کی نئی قدروں اور نئے زاویوں میں مسلمانوں کی زندگی اور موت کی کوئی حقیقت نہیں۔

نقالوں کے اس گروہ کو تقسیم سے پہلے بھی مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ ان کا نصب العین ان اخلاقی اور روحانی قدروں کی تخریب تھا جن پر دین اسلام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے لیے تمام کفر ایک ہو چکا تھا۔ ظلمت کے طوفان اپنی پوری تندی اور تیزی کے ساتھ پاکستان کا محاصرہ کر رہے تھے۔ حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی ایک ہو جائیں اور ایک بار پھر توحید کی مشعل بلند کر کے اس طوفان کے سامنے کھڑے ہو جائیں لیکن یہ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کی جو قوتِ مدافعت اسلام کے نام پر بیدار ہو گی، وہ

اپنے حصار کی بنیاد بھی اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں پر رکھے گی اور پاکستان میں ایسے ادیب کے لیے کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ جس کا مقصد صنفی انارکی، اخلاقی بے راہ روی اور ذہنی انتشار پھیلانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے یہ لوگ نئے عزائم، نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ میدان میں آئے ہیں اور یہ عزائم، یہ امنگیں اور ولولے زیادہ تر پاکستانی مسلمانوں کی ان لوگوں پر کوکین کی مالش کرنے تک محدود ہیں جن پر فسطائیت اپنے خنجر کی تیزی آزما رہی ہے تاکہ خنجر اپنا کام کر جائے۔ لیکن مسلمان کو یہ محسوس نہ ہو کہ رگیں کٹ چکی ہیں اور خون بہ رہا ہے۔

ہندوستان کی بربریت کی صفائی پیش کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے علاوہ ان حضرات کے سامنے باقی مسائل اہل پاکستان کے پیٹ سے متعلق ہیں۔ کچھ عرصہ سے انہیں پاکستان کے عوام اور مزدور کی غربت اور بدحالی پریشان کر رہی ہے، پاکستان کے عوام مزدور کا مسئلہ یقیناً نہایت اہم ہے اور ہم اسے حل کیے بغیر فلاح و ترقی کی منازل کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔ لیکن پاکستان کے عوام اور مزدور اپنے ان کرم فرماؤں سے پوچھتے ہیں۔ ''کیا ہمیں ہندوستانی بھیڑیوں سے اپنے بچوں اور اپنی بیٹیوں کی جانیں بچانے کا کوئی حق نہیں؟ جب مشرقی پنجاب میں مسلم عوام اور مسلم مزدوروں کا قتل عام

ہو رہا تھا، تم کہاں تھے؟.......... آج تمہارے سینوں میں ہمارے
پیٹ کی بھوک کا درد اٹھا ہے لیکن جب اکال سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ
کی تلواریں ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بچوں کی گردنیں کاٹ
رہی تھیں، تمہاری حمیت کہاں گئی تھی؟ تمہاری آنکھوں کے سامنے
لاکھوں انسان قتل ہوئے، عصمتیں لٹیں، عورتوں کو چھینا گیا اور تم نے
انسان کے سب سے بڑے دشمن کی صفائی پیش کرنے کے لیے صرف
یہ کہہ کر قصہ ختم کر دیا کہ یہ فرقہ وارانہ فساد تھا.......... آج ہندوستان
کے ہوائی جہاز کشمیر کے مزدوروں کی بستیوں پر بم برسا رہے ہیں لیکن تم
ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کیا یہ بھی فرقہ وارانہ فساد ہے؟ کشمیر میں
ہماری بقا کی جنگ لڑی جا رہی ہے لیکن تم اس سے منہ پھیر کر پاکستان
کے اندر طبقاتی جنگ چاہتے ہو۔ کہیں تمہارا مقصد ہماری مشکلات حل
کرنے کی بجائے ہمارے دشمنوں کی مشکلات حل کرنا تو نہیں؟

ادیبوں اور شاعروں کا دوسرا گروہ وہ ہے جن کی امنگیں اور ولولے
پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو ابھی
تک زلفوں کے پیچ و خم سے آزاد نہیں ہوئے۔ جب انگریز لال قلعہ
کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے، دہلی کے شعراء کی محفلوں میں
کوچۂ جاناں کی بھول بھلیوں کا رونا رویا جا رہا تھا۔ آج مسلمانوں کا
انگریز سے کہیں زیادہ خطرناک دشمن پاکستان کو محاصرے میں لینے کی

کوشش کر رہا ہے لیکن ہمارے شعراء کے دم خم وہی ہیں جو پہلے تھے۔

ادیبوں کا وہ طبقہ جو حقائق کے بھیانک چہرے پر تصورات کے حسین پردے نہیں ڈالنا چاہتا، اب اس پر بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آج قوم کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ مشرقی پنجاب کے قتلِ عام کے بعد بھی عبرت حاصل نہ کر سکی۔ تو قدرت کے قانون میں اس کے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

قوم کے ادیب! تیرے سامنے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ تیرا شعلہ نوائی ان میں بجلیاں پیدا کر سکتی ہے۔ مشرقی پنجاب اور دہلی کے شہیدوں کا خون خاک میں جذب نہ ہونے دینا۔ تو اس کی روشنائی سے وہ تحریر لکھ سکتا ہے۔ جو قوم کے جوانوں میں نئی زندگی، نئی روح اور نئی تڑپ بیدار کر دے۔



''اے قوم! ہمیں آزادی اور بقا کی جنگ کے لیے عوام کو مجاہدانہ کردار اور سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ قوم میں احساس موجود ہے۔ پاکستان کے عوام اپنی عزت اور آزادی کی بقا کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ اب یہ کام حکومت کی کشتی کے ناخداؤں کا ہے کہ عوام کے احساس اور عوام کی تڑپ کو ایک ناقابلِ تسخیر قوت میں تبدیل کر دیں۔ اینٹ اور گارا موجود

ہے لیکن قلعہ تعمیر کرنا معماروں کا کام ہے.........اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر پاکستان کے دفاع کی ضرورت کا احساس حاوی کر دیا جائے۔کارخانے میں کام کرنے والے مزدور اور کھیت میں ہل چلانے والے کسان کے دل میں اجتماعی حیات کا ولولہ زندہ کر دیا جائے۔مدارس میں ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جائے جس سے قوم کے بچوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سیرت بیدار ہو.........ان عناصر کا سدباب کیا جائے جو تخریبی اور منفی رجحانات کی تبلیغ کر کے قوم میں ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں۔قوم کے ہر اس فرد کے لیے جو بندوق اٹھا سکتا ہو،فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے۔

ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں لیکن ایک بہت بڑی دولت ہمارے پاس ہے،اور وہ یہ کہ ہمارے عوام کا عزم برقرار ہے۔تاریخ انسانی کے بڑے سے بڑے حوادث سے دوچار ہونے کے باوجود ان کے سینوں میں ایمان اور یقین کی مشعلیں روشن ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔کفر کا سیلاب ان کے دلوں سے عشق رسولؐ کی چنگاریاں نہیں بجھا سکا۔ان کی بے غرضی،ان کا ایثار،ان کا خلوص ہماری سب سے بڑی متاع ہے لیکن پاکستان نے آج تک اس متاع گراں بہا سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

جس دریا سے کھیتیاں سیراب نہیں کی جاتیں وہ یا تو کسی جھیل یا سمندر میں جا گرتا ہے اور یا کسی ریگستان میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔جس طاقت کو بروقت قوم کی تعمیر کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا،وہ وقت گزر جانے پر تخریب کی طرف مائل ہو جاتی

ہے۔ پاکستان کے عوام میں زندگی ہے، تڑپ ہے، امنگیں ہیں، ولولے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے طبقہ اعلیٰ کی بے حسی اور جمود ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں کا کام دے رہا ہے۔ ہمارے لیڈروں کے ایک گروہ نے ابھی تک اس بات کا احساس نہیں کیا کہ ان پر ایک ایسی قوم کے بقا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو انسانی تاریخ کے عظیم ترین خطرے کا مقابلہ کر رہی ہے ہمارے سیاست دانوں کی صفوں میں ابھی تک وہ لوگ موجود ہیں جو اپنا حال اور مستقبل عوام کے ساتھ وابستہ کیے بغیر عوام کی لیڈری فرما رہے ہیں۔ مشرقی پنجاب پر مصیبت آئی تو ان میں سے بہت کم ایسے لوگ تھے جنہوں نے عوام کے ساتھ جینا اور مرنا پسند کیا۔ اکثر کی یہ حالت تھی کہ ہوا کے پہلے جھونکے کے ساتھ ہی عوام کو اپنی قیادت کے بوجھ سے آزاد کر کے پاکستان پہنچ گئے۔ وہ جاتے جاتے عوام کو یہ بھی نہ بتا سکے کہ پاکستان کا راستہ اس طرف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مشرقی پنجاب کے عوام اس طوفان کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن جہاں بھی کسی باعمل لیڈر نے ان کی رہنمائی کی تھی انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ بعض بستیوں میں ان کی قوتِ مدافعت کچلنے کے لیے دشمن کو ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں استعمال کرنی پڑیں لیکن عام لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے بعض پہلے ہی لاہور پہنچ کر وزارتوں اور عہدوں کی کرسیوں کا طواف کر رہے تھے۔ بعض لاہور کو بے رونق سمجھ کر کراچی کے جشن میں حصہ لینے کے لیے چلے گئے تھے اور باقی حضرات کے متعلق لاہور ریڈیو کے اعلانات نشر ہو رہے تھے کہ

فلاں لیڈر، فلاں صدر، فلاں سیکٹری اور فلاں ایم ایل اے بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے بیان کیا کہ مشرقی پنجاب کی صورتِ حال تشویشناک ہے۔ ان کے رشتہ داروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کوٹھی نمبر فلاں اور فلاں میں ان سے آملیں۔

مشرقی پنجاب کے جس علاقے کے لوگ یہ سنتے کہ ان کا لیڈر یا ایم ایل اے پاکستان پہنچ گیا ہے تو بلا توقف پاکستان کی طرف چل پڑتے۔ قوم کیمپوں میں سسک رہی تھی اور لیڈر حضرات کو یا الاٹ منٹ کے دفتروں میں سرگرداں یا کسی الاٹ شدہ کوٹھی میں محو استراحت دیکھا جاتا تھا۔ مشرقی پنجاب کے لیڈر ہجرت کے بعد مغربی پنجاب میں اپنے بھائی بندوں سے جا ملے اور مشرقی پنجاب کے عوام کا بوجھ مغربی پنجاب کے عوام کے حصے میں آ گیا۔

مغربی پنجاب کے سامنے مہاجرین کی آبادی کا مسئلہ تھا لیکن جس کارِ عظیم کے لیے انتہائی بے غرض، بے لوث، ان تھک، محنتی اور تجربہ کار کارکنوں کی ضرورت تھی، وہ انتہائی ناتجربہ کار، تن آسان اور خود غرض لوگوں کو سونپ دیا گیا تھا۔ الاٹ منٹوں میں حق اور ناحق کا سوال نہ تھا۔ اصلی اور نقلی مہاجروں کی کوئی تمیز نہ تھی جن لوگوں کی چھوٹے افسروں تک پہنچ تھی، وہ کوئی چھوٹا سا مکان یا چھوٹی دوکان حاصل کر لیتے تھے۔ جو بڑے افسروں کے دروازوں پر دستک دے سکتے تھے۔ وہ بڑی الاٹمنٹ حاصل کر لیتے تھے اور جن کی وزیروں کی کوٹھی تک پہنچ تھی، انہیں سب سے بڑی الاٹمنٹ کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ وزیروں کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک ہی فیکٹری یا کارخانے کے متعلق بیک وقت کئی آدمیوں کے حق میں سفارشی چٹھیاں لکھ دیتے

تھے اور متعلقہ افسر ان چٹھیوں کے احترام میں ایک ہی جائداد کئی آدمیوں کے نام الاٹ کر دیتے تھے اکثر وزرا سب کو خوش رکھو کے جمہوری مسلک پر کاربند تھے عملی حیثیت سے ان کا کام کرنا یا نہ کرنا برابر تھا۔

قوم کے جو کارکن غرض کے بندوں کے لیے تازیانہ بن سکتے تھے، ان کے منہ پر ناجائز الاٹ منٹوں کی مہریں ثبت کر دی گئی تھیں۔

قوم کے عوام ہر آزمائش پر پورے اترے۔ جب ان سے کہا گیا کہ کیمپوں کے بھوکے اور ننگے پناہ گزینوں کو کپڑے اور روٹی کی ضرورت ہے تو انہوں نے اپنے بھائیوں کے تن ڈھانکنے کے لیے اپنے کپڑے اتار دیے۔ انہیں روٹی مہیا کرنے کے لیے خود بھوکا رہنا گوارا کیا.......... مشرقی پنجاب کی حکومت نے نہروں کا پانی بند کر دیا اور ہماری حکومت نے عوام سے نہر کھودنے کی اپیل کی تو عوام بیلچے اٹھا کر دریا کا رخ بدل دینے کے لیے میدان میں آ گئے لیکن اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ جب کیمپوں میں لاکھوں انسان موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے، انہیں مالِ غنیمت سے حصہ وصول کرنے کی فکر تھی۔ الاٹ منٹ کے چشمے سے اپنی کھیتیاں سیراب کر لینے کے بعد وہ اپنے رفقا اور احباب کی کھیتیوں کی طرف متوجہ تھے، جہاں سے انہیں اپنی لیڈری کے لیے ووٹوں کے پھول حاصل کرنے کی امید تھی۔ مہاجرین کے لیڈروں کو کچھ اپنا ہوش نہ تھا۔ پھر جب انہیں الاٹ منٹ کے دھندوں سے فرصت ملی تو ان کے سینوں میں قوم کا درد بیدار ہوا۔

مغربی پنجاب میں بعض ایم ایل اے حضرات کو یہ فکر تھی کہ اگر ان کے انتخابی حلقوں میں مہاجرین گھس آئے تو مستقل لیڈری کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ ان کے علاقوں میں صرف ان کی برادری کے لوگ آباد ہوں۔ ان حضرات نے طوفان کو ساحل سے دیکھا تھا لیکن مشرقی پنجاب سے جو ایم ایل اے اور لیڈر حضرات خون کے دریا میں تیر کر پاکستان کے ساحل تک پہنچے تھے، ان میں سے بھی بعض ایسے ہیں جن کی ذہنیتوں میں تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس بات سے قطعاً شرمسار نہیں کہ وہ قوم کو آگ اور خون کے طوفان میں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ وہ قوم کے خرمنِ حیات کی سلگتی ہوئی چنگاریوں سے بھی اپنی لیڈری کے چراغ جلانے کی فکر میں ہیں۔ قوم ان لوگوں کے لیے وہ گھوڑا ہے جس پر وہ لیڈری کی زین ڈال کر صرف اپنی منازل حیات طے کرنا چاہتے ہیں۔ اب انہیں یہ شکایت ہے کہ ان کے ووٹروں کو مختلف اضلاع میں کیوں آباد کر دیا گیا ہے۔ ان کی لیڈری کا شیرازہ کیوں منتشر کر دیا گیا ہے۔ اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کے ووٹروں کو جگہ جگہ سے ہانک کر ان کے گرد جمع کر دیا جائے۔ انہیں اس سے واسطہ نہیں کہ اب تک چالیس پچاس لاکھ انسان آباد ہو گئے ہیں انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا کس قدر تباہ کن ہوگا۔ اس فارغ البال طبقہ کی لیڈر شپ کے لیے ہمیشہ اپنی بقا کا مسئلہ قوم کی بقا کے مسئلے سے زیادہ اہم ہے۔

مہاجرین اور انصار کا مسئلہ قوم کا اجتماعی مسئلہ ہے۔ قوم کو ان خود غرض لیڈروں سے خبردار رہنا چاہیے جو اس مسئلہ کو اپنی لیڈری کا مسئلہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس

اجتماعی آزمائش کے دور میں قوم کے مہاجرین کا صبر و استقلال اور انصار کا ایثار و خلوص ہی ہمیں کامیابیوں اور کامرانیوں کی اس شاہراہ پر ڈال سکتا ہے جہاں بدروحنین کی فتوحات نے مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کا خیر مقدم کیا تھا۔ مشرقی پنجاب میں ہماری ان گنت قربانیاں اس لیے نہ تھیں کہ وہ بوسیدہ اور متعین لاشیں جنہوں نے آزمائش کے دور میں قوم کو اپنی قیادت کے بوجھ سے آزاد کر دیا تھا اور قوم کی کشتی کے وہ واحد ناخدا جنہوں نے ساحل پر کھڑے ہو کر قوم کی تباہی اور بربادی کا تماشا دیکھا ہے۔ اب انصار اور مہاجرین کے اختلافات کا مسئلہ کھڑا کر کے پھر ایک بار قوم کے کندھوں پر سوار ہو جائیں۔

ہمارے شہیدوں کے خون کا یہ مطالبہ ہے کہ اس سے کسی خالد اعظم، کسی طارق جانباز اور کسی غزنوی بت شکن کی فتوحات کی داستانیں لکھی جائیں۔ اگر پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے عوام نے اس قسم کے تن آسان، لولے لنگڑے، اپاہج انسانوں کو مہاجرین اور انصار کے اختلافات میں اپنی لیڈری کے لیے گنجائش نکالنے کی اجازت دی تو ان کا ایک گروہ مہاجرین اور دوسرا انصار کے کندھوں پر سوار ہو کر پاکستان کے جمہور کو ہمیشہ کے لیے دو متحارب گروہوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرے گا............ جن لوگوں نے اس طوفان سے بھی اجتماعی حیات کا سبق نہیں سیکھا قوم کو ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟

مغربی پاکستان میں ہماری صوبائی سیاست ان شخصیتوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے جن کی ساری دوڑ دھوپ عہدوں اور وزارت کی کرسیوں تک پہنچنے کے لیے ہے۔

لیڈروں کا ایک گروپ چوبیس گھنٹے اپنی وزارت بچانے اور دوسرا گروپ وزارت توڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔

مغربی پنجاب، مغربی پاکستان کے صوبوں میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں انتشار کی یہ حالت ہے کہ ہر ایم ایل اے وزیر بننے کی فکر میں ہے اور روزیر، وزیراعظم بننے کے لیے بیتاب ہے۔ قومی جماعت مسلم لیگ کی حالت اس سے مختلف نہیں۔ ہر وہ شخص جو فکرِ معاش سے آزاد ہے، اپنے محلے، اپنے شہر یا اپنے علاقے کی لیگ کا عہدیدار بننے کی فکر میں ہے، قوم کی آدھی توجہ وزارت کے اکھاڑے میں دنگل لڑنے والے پہلوانوں اور آدھی مسلم لیگ کے عہدوں کے لیے کبڈی کھیلنے والوں کی طرف مبذول ہے۔

آج مغربی پنجاب کا مسئلہ لاکھوں پناہ گزینوں کو آباد کرنا نہیں، بھوکوں کے لیے خوراک اور ننگوں کے لیے کپڑا مہیا کرنا نہیں، دشمن کے جارحانہ ارادوں کے پیشِ نظر عوام کو منظم اور مسلح کرنا نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ وزیر کس کو ہونا چاہیے اور اگر فلاں شخص وزیر بن جائے تو فلاں گروپ کیا کرے گا؟ لیڈروں کی فلاں فلاں پارٹیوں کے درمیان کبڈی کا جو میچ ہو رہا ہے اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

پاکستان کی حکومت گزشتہ واقعات کی روشنی میں پاکستان کے جمہور سے شکایت نہیں کر سکتی کہ ان میں اجتماعی زندگی کے لیے تڑپ نہیں۔ حالات نے عوام کو بہت حد تک بیدار کر دیا ہے۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے خونیں حوادث کے بعد وہ اپنے حال اور مستقبل کے خطرات کو گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اب انہیں بار بار

یہ کہہ کر جھنجھوڑنے کی ضرورت نہیں کہ کشمیر میں ہندوستان کا اقدام جارحانہ ہے۔ وہ اس جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں منظم اور مسلح کر دیا جائے۔ نہرو اور پٹیل کا چیلنج صرف پاکستان کی حکومت کے لیے نہیں۔ یہ ساری قوم کے لیے ہے اور قوم ہی اس کا جواب دے سکتی ہے۔ ہندوستان پاکستان کے خلاف جو فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کر رہا ہے وہ اس براعظم میں کفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہو گا۔ اس جنگ میں پاکستان کی فتح، فرزندانِ توحید کی آزادی اور بقا کی ضامن ہو گی اور اگر خدانخواستہ ہم اپنے اس آخری دفاعی حصار کو بھی نہ بچا سکے تو ہمیں مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پاکستان کا دفاع ہمارا سب سے بڑا اور سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں باقی مسائل نظر انداز کر دینے چاہئیں لیکن جو گھر سیلاب کی زد میں کھڑا ہو اور اس کے مکین یا محافظ سیلاب کے سامنے بند لگانے کی بجائے اپنی ساری توجہ اندرونی صفائی اور آرائش کی طرف مبذول کر دیں تو انہیں کیا کہا جائے گا؟ اور پاکستان کی ابھی یہ حالت ہے کہ ہم تباہیوں اور بربادیوں کے طوفانوں سے گزرنے کے بعد ایک خطۂ زمین پر آ کر بیٹھ گئے اور ہم نے گھر بنانے کے لیے بنیادیں کھودنا شروع کر دیں۔ مکان کی ابھی دیواریں بھی استوار نہیں ہوئیں اور ہمارے دشمن نے اس کی طرف سیلاب کا رخ پھیر دیا لیکن ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سیلاب سے آنکھیں بند کر کے اس بحث میں مصروف ہو گئے ہیں کہ مکان کی چھت اس طرح کی ہونی چاہیے، کھڑکیاں یوں ہونی چاہئیں، دروازوں کی لمبائی اور چوڑائی اتنی ہونی

چاہیے .... یہ نقشہ جس کے مطابق بنیادیں کھودی جارہی ہیں، غلط ہے، فلاں نقشہ صحیح ہے۔



اے قوم! انسانوں کا وہ گروہ جو بھیڑوں کی زندگی اختیار کرتا ہے، بھیڑیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔ ہم میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صرف چرواہے کہلانے کے شوق میں جمہور کو بھیڑوں کی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ لیڈری کے بعض خواہش مندوں کو اندیشہ ہے کہ جب قوم متحد ہو کر جہد و عمل کے میدان میں نکل آئے گی تو ان کی منفی اور تخریبی صلاحیتوں کی قیمت گھٹ جائے گی۔ اس لیے وہ قوم کے شیرازے کو ہر قیمت پر منتشر رکھنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے گزشتہ صدیوں میں بارہا ملت کی چٹان کو خود غرضی کے تیشوں سے پاش پاش کیا ہے۔ اسلام ایک تھا لیکن انہوں نے اس کی وحدت کو فرقوں، گروہوں، نسلوں اور خطوں میں تقسیم کیا۔ آلام و مصائب کے ادوار مین بھی جب مسلمانوں میں اتحاد و تنظیم کی روح بیدار ہوتی تھی، یہ لوگ میدان میں نکل آتے تھے۔ جب اہل غرناطہ پر مصائب کی گھٹائیں نازل ہو رہی تھیں، یہ لوگ انہیں عربی، اندلسی اور بربری کے نام پر لڑا رہے تھے۔ جب بغداد پر تاتاری یورش کر رہے تھے، یہ لوگ مختلف فرقوں میں منافرت پھیلانے میں مصروف تھے۔

آج پاکستان میں اسی قسم کا گروہ صوبائی عصبیت کا بیج بونے کی فکر میں ہے۔ ہم

ایک ہیں۔ ہمارے مسائل بھی ایک ہیں۔ اگر اسلام عرب میں عربی اور عجمی، قریش اور حبشی کی تفریق کے خلاف تھا تو پاکستان میں بھی پنجابی، سندھی، سرحدی، بلوچستانی اور بنگالی کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پاکستان کے انعامات اور پاکستان کے مصائب میں ہم سب یکساں حصے دار ہیں۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان میں صوبوں کی تقسیم کو ایک وحدت ملی کے اندر جذب کر دیں۔ اجنبی سامراج نے صوبائی حد بندیوں سے پنجابی کے لیے سندھی، سندھی کے لیے سرحدی اور سرحدی کے لیے بلوچستانی کو اجنبی بنا دیا تھا لیکن پاکستان کی بقا اور استحکام کا راز ان حد بندیوں کو ختم کر دینے میں ہے۔ قوم کو ان غرض کے بندوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر تمام مسلمان ایک ہو گئے تو ہمارے لیے زندہ باد کے نعرے کون لگائے گا۔

ایک کچھوا ایک گدلے پانی کے جوہڑ سے مچھلیاں شکار کیا کرتا تھا۔ جب برسات کے دن آئے اور آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ مل کر ایک بڑی جھیل میں تبدیل ہونے لگے تو کچھوے کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اگر اس کا جوہڑ بھی جھیل کے ساتھ مل گیا تو جھیل کے وسیع رقبے اور گہرے پانی میں مچھلیوں کا شکار مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے مچھلیوں سے کہا۔ ”تم جوہڑ کے کناروں پر بند لگا دو، ورنہ تمہاری عزت اور آزادی بہت بڑے خطرے کا سامنا کر رہی ہے۔ تم چھوٹی چھوٹی لہروں سے دل بہلانے کے عادی ہو اور جھیل میں تمہیں بڑی بڑی لہریں پریشان کیا کریں گی۔“

پاکستان کے صوبوں میں اس قماش کے معتبرین کی کمی نہیں۔ جب یہ لوگ صوبوں کی مکمل آزادی اور خودمختاری کا نعرہ لگاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں لوٹ مار کی پوری آزادی ہو اور مرکز اس قدر کمزور ہو کہ وہ مدافعت نہ کر سکے۔ صوبوں کا درد ان کے دل میں نہیں، پیٹ میں اٹھتا ہے لیکن چند آدمیوں کی خوشنودی کے لیے قوم کا اجتماعی مفاد قربان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ قوم جو ہندوستان کے اژدہوں اور نہنگوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، اسے ان کچھوؤں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے، جو قربانیاں قوم نے پاکستان کے لیے دی ہیں، وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر تھیں۔ ہمارے اجتماعی اور قومی شعور کی اساس ہی دین اسلام پر ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ جب بھی ہم نے دین الٰہی کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا ہے، ہم ہر مصیبت اور ہر ابتلا کے دور سے سرخرو ہو کر نکلے ہیں۔ جب بھی ہم نے ذوقِ یقین سے لبریز ہو کر اسلام کی شاہراہ پر قدم رکھا، ہمارے سامنے پہاڑوں نے سر جھکا دیے اور جب بھی ہم نے اپنے سینوں میں عشق محمدؐ کی قندیلیں روشن کیں، آلام و مصائب کی تاریکیاں ہمارے پاؤں متزلزل نہ کر سکیں۔

اسلام ہمارے لیے وہ ڈھال ہے جو کفر کے ہر تیر کو روک سکتی ہے۔ اسلام ہمارے ہاتھ میں وہ تلوار دیتا ہے۔ جو ہر تلوار کو کاٹتی ہے۔ اسلام ظلمت کی گھٹاؤں میں ہمارے سامنے روشنی کا وہ مینار ہے جو بار بار ہمارے سفینے کو ساحل مقصود تک پہنچا

چکا ہے۔ آج ہم موت کے منہ سے نکل کر زندگی کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور اسلام وہ چشمہ ہے، جس سے قیامت تک زندگی کے دھارے پھوٹتے رہیں گے۔ کفر کی آندھیوں کے سامنے ہم اپنے منتشر شیرازے کو صرف اسلام کی رسی سے باندھ سکتے ہیں۔ اسلام ہی ہماری راکھ کے انبار سے بجلیاں پیدا کر سکتا ہے۔

اگر ہم خلوص نیت سے پاکستان کی نیام میں اسلام کی تلوار کو جگہ دیں تو وحشت اور بربریت کا طوفان جس تندی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی رفتار سے سمٹتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ زمین جو ہمارے شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہوئی ہے وہ ہمارے سپاہیوں کے پاؤں کو بوسے دے گی۔ جس آسمان نے قوم کی بیٹیوں اور بچوں کی جگر دوز چیخیں سنی ہیں، وہ ہمارے غازیوں کے نعرے سنے گا۔ جو مساجد، مندروں اور گوردواروں میں تبدیل کر دی گئی ہیں، وہاں پھر ایکبار اللہ اکبر کی صدائیں گونجیں گی۔



اے قوم! میں تجھے عافیت پسندوں کے اس گروہ سے خبردار کرتا ہوں۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کی صلح جوئی اور امن پسندی ہندوستان کے جارحانہ عزائم بدل دے گی۔ گزشتہ واقعات بارہا اس حقیقت کا ثبوت دے چکے ہیں کہ ہندو فاشزم صرف تلوار کی زبان سمجھ سکتا ہے۔

بھارت میں اس تہذیب وتمدن کا احیا ہو رہا ہے۔ جس کی بنیاد نفرت اور حقارت

کے جذبے پر رکھی گئی ہے۔ ہندو طاقتور کا احترام کرتا ہے نہیں بلکہ اس کی پوجا کرتا ہے اور کمزور کو اچھوت کا درجہ دے کر کچل ڈالتا ہے۔ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کے انتشار اور کمزوریوں نے ہندو کی اچھوت دشمنی کو اسلام دشمنی میں تبدیل کر دیا اور جس قدر اسلام، ہندو مذہب کی ضد ہے، اسی قدر ہندو کے لیے مسلمان کا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ ہماری شرافت، ہماری صداقت امن پسندی اور نیکی اس وقت تک اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک ہم بزور بازو اس سے زندہ رہنے کا حق نہیں منواتے۔

ہندوستان کے صنم خانوں سے جو آگ نمودار ہوئی ہے وہ دس کروڑ فرزندانِ توحید کو بھسم کرنا چاہتی ہے۔ یہ آگ ہمیشہ کسی محمد بن قاسم اور کسی محمود غزنوی کی منتظر رہے گی۔

گزشتہ واقعات ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے ہاتھوں میں صلح و آشتی کے پھول دیکھ کر یہ آگ خود بخود ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ہمیں اس تلخ حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہندوستان میں قتلِ عام کے ساتھ کفر اور اسلام کا فیصلہ کن معرکہ شروع ہو چکا ہے اور ہمیں صرف ایک ناقابلِ تسخیر عزم ہی برہمنی استبداد کے غلبہ سے بچا سکتا ہے۔

پاکستان فقط آٹھ کروڑ مسلمانوں کا دفاعی حصار نہیں بلکہ اس کی بقا اور استحکام ہمارے ان تین کروڑ بھائیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے جو انگریز کے بعد ہندو استبداد کی چکی میں پس رہے ہیں .... آج ان کے دروازوں پر موت کا

پھرا ہے۔ آج ان کی بے بسی اس لڑکی کی مظلومیت سے کہیں زیادہ ہے، جس کی فریاد نے محمد بن قاسم کی تلوار کو بے نیام کیا تھا۔ آج یہ تین کروڑ انسان اس تلوار کو اپنی شاہ رگ کے قریب دیکھ رہے ہیں جس نے مشرقی پنجاب لاکھوں انسانوں کو قتل کیا ہے۔ آج ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اگر پاکستان جاہ پسندوں اور وزارتوں اور عہدوں کی کرسیوں کے بھوکوں کا اکھاڑہ بنا رہا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔

اگر پاکستان ہندوستان کے تین یا ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھا سکا تو ان کے لیے موت، جلاوطنی، یا ترکِ اسلام کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

ہندوستان کا حکمران طبقہ جس قدر اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرے گا اسی قدر اسے ہندو عوام میں مقبولیت حاصل ہوگی۔ صفِ اول کے کانگرسی لیڈروں میں پٹیل نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ثابت کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندو عوام پر اس کا اثر و اقتدار گاندھی اور نہرو کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیڈر پٹیل کے مقابلے میں کہیں زیادہ انتہا پسند ہیں اور واقعات کے پیشِ نظر ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ آنے والے دور میں ہندوستان کی قسمت ان جنونیوں کے ہاتھ میں ہوگی جو ہندو رائے عامہ کے سامنے یہ ثابت کرسکیں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے متعلق ان کے عزائم پٹیل اور نہرو کی نسبت کہیں زیادہ بھیانک ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب نہرو اور پٹیل کی کرسیوں پر ہمیں سیوا سنگھی اور مہا سبھائی نظر آئیں گے اور ہندوستان کے کونے کونے میں مشرقی پنجاب کی تاریخ

دہرائی جائے گی اور اگر پاکستان کے مسلمانوں نے محض تماشائیوں کی حیثیت میں اپنے کروڑوں بھائیوں کا قتلِ عام دیکھا تو یہ ان کا ایک ایسا جرم ہوگا جو شاید قدرت معاف نہ کرے۔

وحشت اور بربریت کے سیلاب سے جو لوگ بچ کر نکلیں گے، ان کی آخری جائے پناہ پاکستان ہو گی لیکن پاکستان میں ان کروڑوں نئے مہاجرین کے لیے جائے پناہ تلاش کرنا ناممکن ہوگا۔

کسی دن اچانک ہم یہ سنیں گے کہ آج ہندوستان کی عنانِ اقتدار کسی مہاسبھائی یا سیوا سنگھی نے سنبھال لی ہے اور جس تندی اور تیزی سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تندی اور تیزی سے ہندوستان کے باقی صوبوں میں ان کا قتل عام شروع ہو چکا ہے۔ اس وقت کائنات کا ضمیر پاکستان کے ہر بچے اور بوڑھے سے بھی اس سوال کا جواب پوچھے گا۔ ''کیا تم صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو.............؟''

ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں سوشلزم یا کمیونزم کا تحریکیں ہندو عوام کے تخریبی رجحانات بدل دیں گی۔ جب تک برہمن ازم کے علم برداروں کے سامنے مسلمانوں کا ہدف موجود ہے وہ کسی دقت کا سامنا کیے بغیر بھارت کے ترکش کے ہر تیر کو ان کے خلاف استعمال کرتے رہیں گے۔ ہندوستان میں جب بھی کوئی عوامی تحریک اٹھے گی، اس کا رخ مسلمان کی طرف پھیر دیا جائے گا۔



قوم کے سپاہیو!

تمہارے لیے میرے پاس تشکر کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ جب قوم کی کشتی گرداب میں تھی، تم روشنی کا مینار تھے، جب قوم کے رہنماؤں کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے، تم اپنی جگہ فولاد کی چٹانوں کی طرح کھڑے تھے۔ جب قوم کی رگوں کا خون منجمد ہو چکا تھا، تمہارے سینوں میں زندگی کے ولولے کروٹیں لے رہے تھے۔

تم وہ خوش نصیب ہو جنہیں قدرت نے عالم اسلام کے سب سے بڑے حصار کی حفاظت پر مامور کیا ہے۔

بھارت میں کفر اپنے تمام تخریبی عناصر کو متحد اور منظم کر چکا ہے اور تم اسلام کے ترکش کے آخری تیر ہو۔ کفر کو آج بھی اپنی تعداد، اپنے اسلحہ اور اپنے خزانوں پر ناز ہے لیکن اگر تم اپنے دلوں میں مردِ مومن کا ایمان زندہ کر سکے تو اس زمین پر پھر ایک بار بدر و حنین کی داستانیں دہرائی جائیں گی۔

اگر تم زندگی کے امتحان میں اسلام کی کسوٹی پر پورے اتر سکے تو پاکستان تمہارا ہے۔ کشمیر تمہارا ہے .... خدا کی زمین تمہاری ہے، عزت، آزادی، فتح اور کامرانی سب تمہارے لیے ہیں۔ تم ہندوستان میں اپنے تین کروڑ مجبور اور بے بس بھائیوں کو وہی پیغام دے سکو گے جو عرب کے کمسن سالار نے راجہ داہر کے قیدیوں کو دیا تھا .... ریڈکلف ایوارڈ ہماری رگ جان پر ایک رستا ہوا ناسور ہے لیکن ماضی کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ دنیا کے نقشے پر ٹیڑھے نقوش ہمیشہ نوک

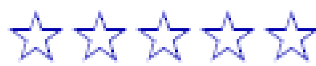
شمشیر سے درست کیے گئے ہیں۔

قوم کے نوجوانو! اور پاکستان کے معمارو!

یہ کبھی نہ بھولو کہ پاکستان تمہیں ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ پاکستان کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے تم قدم قدم پر لاشوں کے انبار چھوڑ کر آئے ہو اور اس کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے مزید قربانیوں کی ضرورت ہے۔

جب تک نہرو کی افواج کشمیر میں ہیں، جب تک قوم کی پچاس ہزار بہو بیٹیاں پنجہ اغیار میں ہیں اور جب تک تمہاری قوم کے تین کروڑ فرزند انسانیت کے بدترین دشمن کے رحم و کرم پر ہیں اور تم ان کے حق میں کوئی مؤثر آواز بلند نہیں کر سکتے تو یہ سمجھو کہ جس مقصد کے لیے پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی، وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔

دنیا میں صلح و امن بہت بڑی نعمت ہے لیکن صلح و امن فقط ان کے لیے ہے جو شر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جب تک پاکستان بیرونی خطرات سے پاک نہیں ہوتا، تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس دفاعی حصار کی تعمیر تمہارے حصے کا کام باقی ہے.........تمہارے ہاتھ زخمی ہیں لیکن قوموں کی عظمت کے تاج محل ہمیشہ ان معماروں نے کھڑے کیے ہیں جن کے ہاتھ زخمی تھے۔"



ستمبر ۱۹۴۸ء میں قوم اس رجل عظیم کی رہنمائی سے محروم ہوگئی جس نے اسے آندھیوں اور تاریکیوں میں پاکستان کی منزل دکھائی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح قوم کی کشتی کے وہ ناخدا تھے جنہوں نے قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد تک تاریخ انسانی کے مہیب ترین طوفان کا مقابلہ کیا تھا۔ ان کی وفات کی خبر قوم کے ہوش و حواس پر بجلی بن گری اور اس کے بعد یہ خبر آئی کہ ہندوستان کی وحشت اور بربریت کا سیلاب حیدرآباد کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ جواہر لال نہرو کی افواج کے ٹینک نہتے رضاکاروں کی لاشوں پر سے گزر رہے ہیں۔ ایسے نازک مرحلے میں قوم جس آواز کا انتظار کیا کرتی تھی، وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

بھارتی حکومت مدت سے حیدرآباد دکن پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہی تھی .... لیکن جارحانہ اقدام سے پہلے بھارت کو اس اطمینان کی ضرورت تھی کہ حیدرآباد اس کے لیے ایک اور کشمیر ثابت نہیں ہوگا اور یہ اطمینان انہیں نظام حیدرآباد سے زیادہ اور کوئی نہیں دلا سکتا تھا۔

رضاکار سر پر کفن باندھ کر میدان میں آ رہے۔ ان کے قائد سید قاسم رضوی نے پھر ایک بار ٹیپو کا یہ نعرہ بلند کیا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ لیکن وہ غیور انسان جو صرف دیسی رائفلوں، برچھیوں سے مسلح ہونے کے باوجود ہندوستان کے ٹینکوں، طیاروں اور توپوں کا چیلنج قبول کر چکے تھے، نظام کی غداری اور بزدلی کی تاب نہ لا سکے۔ حیدرآباد دکن کی جنگ لاکھوں مسلمانوں کے

لیے زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندو فسطائیت کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ان کا کیا انجام ہوگا۔

بے سروسامان رضا کار اس امید پر ہندوستان کی توپوں اور ٹینکوں کے سامنے کھڑے ہو گئے کہ نظام کی فوج بقا کی جنگ میں قوم کا ساتھ دے گی لیکن نظام نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اس کے اسلاف کے خون کا رنگ نہیں بدلا۔ جب دکن کے رضا کار دشمن کے ٹینکوں کے سامنے لیٹ رہے تھے، نظام کی فوج سکندر آباد میں حملہ آوروں کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھی۔

حیدر آباد جنوبی ہند میں مسلمانوں کا آخری دفاعی حصار تھا۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل و غارت کا طوفان شروع ہوا تھا، مدارس، بمبئی اور سی پی سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے حیدر آباد میں پناہ لے چکے تھے۔ حیدر آباد کی تباہی کی داستان بغداد اور غرناطہ کی تباہی کی داستانوں سے مختلف نہ تھی.........وہ زمین جس نے صدیوں تک مسلمانوں کا جاہ و جلال دیکھا تھا، اب بے گناہوں کے خون اور بے کسوں کے آنسوؤں سے سیراب ہو رہی تھی۔ حیدر آباد میں مسلمانوں کی صدیوں کی آزادی اور حکومت کی تاریخ ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوئی کہ قوموں کی دشمنی کے لیے پٹیل اور نہرو کی نسبت گھر کے غدار زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ گھر جس کا پاسبان چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ مل جائے ہمیشہ تباہی کا سامنا کرتا ہے۔

حیدر آباد میں خون کی ہولی کھیلنے کے بعد نہرو کی سفاکی اپنے اوجِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ ایو این او کی خاموشی نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ بین الاقوامی مجلسیں تلوار

کے فیصلے رد نہیں کرتیں۔ حیدر آباد کی تسخیر کے ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت کشمیر پر ایک فیصلہ کن حملہ کر چکی تھی۔ ایک طرف بے سروسامان مجاہدین کا عزم و استقلال تھا اور دوسری طرف وحشیوں کے ریوڑ ہندوستانی حکومت کے تمام وسائل کے ساتھ میدان میں آ چکے تھے۔ ہندوستان کی توپیں اور ٹینک آگ اگلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے............ جنگ کے شعلے پاکستان کی حدود کے پاس پہنچ چکے تھے۔

کیا پاکستان ہندوستان کو دکن کی طرح کشمیر میں بھی تلوار کا فیصلہ منوانے کی اجازت دے گا۔ کیا پاکستان یہ گوارہ کرے گا کہ پینتیس لاکھ انسان مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔؟۔۔۔ پاکستان کے سپاہی نے ان سوالات کا جواب دینے کے لئے اپنی سنگین اٹھائی، اور دشمن کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔



سلیم تین ہفتوں سے میر پور کے ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ جہاد کشمیر میں وہ دوسری بار زخمی ہوئی تھا۔ پہلی بار اس کا زخم معمولی تھا۔ لیکن دوسری بار دشمن کے ایک اہم مورچے پر حملہ کرتے ہوئے وہ بری طرح زخمی ہوا۔ اسے علاج کے لئے میر پور کے ہسپتال میں بھیجا گیا۔

آپریشن کے بعد جب اسے ہوش آیا تو ایک بوڑھا ڈاکٹر اس کے قریب کھڑا پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر شوکت تھا۔

سلیم کا پہلا سوال یہ تھا ”میں دوبارہ کب محاذ پر جا سکوں گا۔؟۔ ڈاکٹر شوکت

نے قدرے فکر مند نگاہوں سے سلیم کو دیکھا اور جواب دیا۔ بیٹا تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بازو کا زخم تو بہت جلد اچھا ہو جائے گا، لیکن تمہاری ٹانگ ۔۔۔۔

سلیم نے چونک کر کہا، ہاں میری ٹانگ کے متعلق ۔۔۔۔

ڈاکٹر شوکت نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تشویش کی کوئی بات نہیں'' لیکن تمہیں کافی دیر آرام کرنا پڑے گا۔

''آرام'' سلیم نے اپنے چہرے پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ''آرام میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ مجھے اس خاموشی سے وحشت ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر شوکت ایک اسٹول گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا، اور بولا بیٹا گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ تمہیں بہت جلد آرام آ جائے گا۔

سلیم نے کہا آپریشن سے پہلے آپ میری ٹانگ کے متعلق بہت پریشان تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں کب تک میدان میں جانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ گھٹنے سے نیچے پاؤں تک میری ٹانگ بالکل بے حس ہو چکی ہے''۔

ڈاکٹر شوکت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دور سے ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ آواز قریب آتی گئی۔ مریض ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر سے کسی نے بلند آواز میں کہا، لیٹ جاؤ۔ وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہسپتال سے کچھ دور بموں کے دھماکوں اور مشین گنوں کی تڑتڑ سنائی دینے لگی۔ ایک بم ہسپتال کے ایک کونے کے قریب پھٹا اور ایک روشن دان اور کھڑکی کے چند شیشے اڑ گئے۔ ایک مریض اچانک اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بلند آواز میں چلایا ''تم